حکومت بہار

اردو ڈائرکٹوریٹ

بہار، پٹنہ

فرد نامہ-۴

کلیم الدین احمد

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

Monograph-4

Kaleemuddin Ahmad

By Dr. Shahab Zafar Azmi

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو کے نقادِ اعظم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اردو تنقید، شاعری، تذکرے، داستان اور کئی اصناف کا غیر جانبدارانہ، سخت گیر اور مدلل احتساب کیا نیز اردو میں معروضی و عملی تنقید کی بنیاد رکھی۔ 'اردو شاعری پر ایک نظر'، 'اردو تنقید پر ایک نظر'، 'تحلیل نفسی اور ادبی تنقید'، 'اردو زبان اور فن داستان گوئی'، 'عملی تنقید' اور 'اقبال ایک مطالعہ' جیسی کتابیں جہاں اردو تنقید کو اعتبار کی بلندی تک پہنچاتی ہیں، وہیں آنے والی نسلوں کو تنقید کا اعلیٰ معیار و اقدار فراہم کرتی ہیں۔ کلیم الدین احمد کی دیگر ادبی تصانیف مثلاً 'اپنی تلاش میں'، 'میری تنقید ایک بازدید'، 'میر انیس'، 'معاصر'، 'جامع انگریزی اردو لغت'، 'اصنام'، 'دیوان جوشش'، 'کلیات شاذ' ان کی بے پناہ علمیت، وسیع تر مطالعے اور اعلیٰ فکر و نظر پر دال ہیں۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اردو کے ایک جواں سال، معتبر، ادیب، ناقد اور صحافی ہیں۔ ان کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۷۲ء کو ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا عبدالبرا عظمی سے ہی حاصل کی، اس کے بعد مگدھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جون ۲۰۰۳ء میں ان کا تقرر پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہوا، جہاں ابھی وہ بحیثیت ایسوسئیٹ پروفیسر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے مضامین ملک و بیرون ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ گذشتہ دس برسوں سے وہ شعبہ اردو کے تحقیقی جریدہ 'اردو جرنل' کے مدیر ہیں۔ اب تک ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں 'اردو کے نثری اسالیب'، 'فرات'، 'مطالعہ و محاسبہ'، 'اردو ناول کے اسالیب'، 'جہانِ فکشن'، 'متن اور معنی'، 'صالحہ عابد حسین: فنی و فکری جہات'، اور 'مطالعاتِ فکشن' قابلِ ذکر ہیں۔

شہاب ظفر اعظمی کا یہ فرد نامہ کلیم الدین احمد جیسے عظیم نقاد کی شخصی، ادبی اور تنقیدی جہات کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیش کش آپ کو پسند آئے گی۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

کلیم الدین احمد

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۴

Kalimuddin Ahmad

By

Dr. Shahab Zafar Aazmi

نام کتاب	:	کلیم الدین احمد
مصنف	:	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی
سال اشاعت	:	2019ء
کل صفحات	:	120
کمپوزنگ	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
ترتیب وتزئین	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ

ملنے کا پتہ :
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱
فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

مشمولات

پیش لفظ:	امتیاز احمد کریمی	۴
کلیم الدین احمد: ایک معروضی تعارف	اسلم جاوداں	۶
ابتدائیہ :	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۹

عنوانات

کلیم الدین احمد: ایک نظر میں	۱۱
کلیم الدین احمد: شخصیت اور سوانح	۱۵
کلیم الدین احمد کے افکار و نظریات	۲۷
کلیم الدین احمد کی تنقیدی خدمات	۳۶
کلیم الدین احمد کی تحقیقی خدمات	۷۱
کلیم الدین احمد کی شاعری	۷۸
کلیم الدین احمد کی دیگر ادبی خدمات	۸۳
نمونۂ نثر	۹۱
نمونۂ نظم	۹۸
اختتامیہ	۱۰۹
کتابیات	۱۱۱

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعر و ادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سر بلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی و شعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، فضلِ حق آزاد، شوق نیموی، انجم مانپوری، یاس یگانہ چنگیزی، بیدل عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطا کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، کلیم احمد عاجز، رضا نقوی واہی، واقف عظیم آبادی، رمز عظیم آبادی، شکیلہ اختر، شین مظفر پوری، غیاث احمد گدّی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعر و ادب بجا طور ناز کر سکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب، دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعر و ادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدردان ہے، نیز ان کے ادبی و شعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان و ادب کی قدر و منزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری و ادبی خدمات کی تفہیم اور ان کے شخصی تعارف کے لئے شاد عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجز، سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہی، وہاب اشرفی، رمز عظیم آبادی، پرویز شاہدی اور شین مظفر پوری پر فرد نامے شائع کئے جارہے ہیں۔

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو کے نقادِ اعظم تسلیم کئے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنی تحریروں میں اردو تنقید، شاعری، تذکرے، داستان اور کئی اصناف کا غیر جانبدارانہ، سخت گیر اور مدلل احتساب کیا نیز اردو میں معروضی و عملی تنقید کی بنیاد رکھی۔'اردو شاعری پر ایک نظر'، 'اردو تنقید پر ایک نظر'، 'تحلیل نفسی اور ادبی تنقید'، 'اردو زبان اور فنِ داستان گوئی'، 'عملی تنقید' اور 'اقبال ایک مطالعہ' جیسی کتابیں جہاں اردو تنقید کو اعتبار کی بلندی تک پہنچاتی ہیں، وہیں آنے والی نسلوں کو تنقید کا اعلیٰ معیار واقدار فراہم کرتی ہیں۔کلیم الدین احمد کی دیگر ادبی تصانیف مثلاً 'اپنی تلاش میں'، 'میری تنقید ایک باز دید'، 'میر انیس'، 'معاصر'، 'جامع انگریزی اردو لغت'، 'اصنام'، 'دیوان جوشش'، 'کلیات شاد' ان کی بے پناہ علمیت، وسیع تر مطالعے اور اعلیٰ فکر و نظر پر دال ہیں۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اردو کے ایک جواں سال، معتبر، ادیب، ناقد اور صحافی ہیں۔ان کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۷۲ء کو ہوئی۔انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا عبدالبر اعظمی سے ہی حاصل کی، اس کے بعد مگدھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔جون ۲۰۰۳ء میں ان کا تقرر پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہوا، جہاں ابھی وہ بحیثیت ایسوسیئٹ پروفیسر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان کے مضامین ملک و بیرون ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔گذشتہ دس برسوں سے وہ شعبۂ اردو کے تحقیقی جریدہ 'اردو جرنل' کے مدیر ہیں۔اب تک ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں 'اردو کے نثری اسالیب'، 'فرات'، 'مطالعہ و محاسبہ'، 'اردو ناول کے اسالیب'، 'جہانِ فکشن'، 'متن اور معنی'، 'صالحہ عابد حسین: فنی و فکری جہات'، 'اور مطالعاتِ فکشن قابلِ ذکر ہیں۔

شہاب ظفر اعظمی کا یہ فرد نامہ کلیم الدین احمد جیسے عظیم نقاد کی شخصی، ادبی اور تنقیدی جہات کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔ہمیں امید ہے کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیش کش آپ کو پسند آئے گی۔

امتیاز احمد کریمی
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

کلیم الدین احمد: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو ادب کے سب سے زیادہ مستند اور محترم ناقد کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں امتیازی شناخت کے حامل ہیں۔انہوں نے اردو میں تنقید نگاری کو جو معروضیت، ژرف نگاہی، قطعیت اور واضح بیانی عطا کی وہ ان سے قبل نادر و نایاب تھی۔انہوں نے اردو شعر و ادب کا جس سخت اصول پسندی، معیار بندی اور قطعیت کے ساتھ جائزہ لیا اس سے قبل اس کی مثال نہیں ملتی۔ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اُس میں مغرب زدگی پائی جاتی ہے اور وہ مشرقی اقدار سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ انہوں نے غزل جیسی دلکش اور مقبول ترین صنفِ سخن کی برتر ادبی حیثیت کی نفی کرتے ہوئے اُسے ''نیم وحشی صنفِ سخن'' کہا۔ان کے تنقیدی رویّے میں سخت گیری پائی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اُردو ادب میں تنقید کے وجود کی یکسر نفی کرتے ہوئے کہا: ''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔یہ اُقلیدس کا خیالی نقطہ ہے، یا معشوق کی موہوم کمر''۔

کلیم الدین احمد کے مذکورہ دونوں جملوں نے ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور اس پر زبردست ادبی ہنگامہ آرائی ہوئی۔ان کی مخالفت میں سینکڑوں مقالے لکھے گئے؛ لیکن بالآخر بیشتر اربابِ قلم کو تسلیم کرنا پڑا کہ کلیم الدین احمد کی تنقید مضبوط اور مدلل بنیاد رکھتی ہے، جس کو کسی طور سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔آہستہ آہستہ اردو تنقید پر کلیم الدین احمد کی بالادستی تسلیم کر لی گئی۔بہت سے دانشورانِ ادب کی نظر میں کلیم الدین احمد کی تنقید حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے اور آج بھی وہ اردو کے سب سے بڑے ناقد تسلیم کئے جاتے ہیں۔

کلیم الدین احمد ۱۵/ستمبر ۱۹۰۸ء کو پٹنہ سیٹی کے خواجہ کلاں محلّہ میں ساڑھے چھ بجے شام میں منگل کے روز پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام عظیم الدین احمد اور والدہ کا نام نفیسہ خاتون تھا۔حافظ عبدالکریم نے اُنھیں گھر کے بچے بچیوں کے ساتھ ابتدائی تعلیم دی۔ان کے بچپن کا نام رحیم الدین احمد تھا؛ لیکن جب محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سیٹی میں نویں درجے میں داخلہ ہوا تو ان کا نام کلیم الدین احمد اور سال پیدائش ۱۹۰۹ء لکھوایا گیا۔انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم-اے کیا اور اعلیٰ

تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسٹیٹ اسکالرشپ پر اِنگلینڈ گئے۔ وہاں انہوں نے اِنگلش اور موڈرن لینگوئجز میں سیکنڈ ڈِویژن سے ٹرائی پوس کیا۔ ۳۱/اگست ۱۹۳۳ء کو وہ پٹنہ کالج کے انگریزی کے شعبہ میں لکچرر ہوئے۔ اُن کی پہلی شادی ۱۹۲۸ء میں حنیفہ بیگم سے ہوئی۔ اُن کے انتقال کے بعد دوسری شادی اہلیہ (حنیفہ بیگم) کی بڑی بہن زہرہ بیگم سے ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔

کلیم الدین احمد نے تیس برس کی عمر میں تنقید نگاری کا آغاز کیا۔ اُن کی پہلی کتاب ''گُلِ نغمہ'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، جو اُن کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اِس کے بعد انہوں نے اپنی مشہورِ زمانہ کتابیں ''اردو شاعری پر ایک نظر'' اور ''اردو تنقید پر ایک نظر'' لکھیں اور ۱۹۴۰ء میں تنقیدی و تحقیقی رسالہ ''معاصر'' جاری کیا، جس نے خاصی شہرت حاصل کی۔

اکتوبر ۱۹۵۲ء میں کلیم الدین احمد، پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ۱۵/اگست ۱۹۵۸ء سے سبکدوشی کی تاریخ؛ یعنی ۱۴/ستمبر ۱۹۶۷ء تک ڈی، پی، آئی (ڈائرکٹر آف پبلک اِنسٹرکشن) جیسے باوقار عہدے پر فائز رہے۔ ستمبر ۱۹۶۷ء سے جنوری ۱۹۷۰ء تک بہار اسکول اکزامینیشن بورڈ کے صدر نشیں رہے۔ فروری ۱۹۷۰ء سے اگست ۱۹۷۲ء تک خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر رہے۔ ۱۹۷۴ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی کی جامع اِنگلش اردو ڈکشنری کے چیف ایڈیٹر رہے۔ جولائی ۱۹۸۰ء سے دِسمبر ۱۹۸۲ء تک بہار اردو اکادمی کے نائب صدر نشیں بھی رہے۔

کلیم الدین احمد نے اِبتدا میں غزلیں بھی کہیں؛ مگر وہ محفوظ نہ رہ سکیں؛ لیکن ان کی نظموں کے دو مجموعے ''بیالیس نظمیں'' اور ''پچیس نظمیں'' شائع ہو چکی ہیں۔ ''اردو زبان اور فن داستان گوئی'' لکھ کر اُنہوں نے اُردو میں داستان گوئی کے خدوخال بھی واضح کیے۔ ''جامع اِنگلش اردو ڈکشنری'' (چھ جلد) اور ''فرہنگ ادبی اصطلاحات'' کی تدوین اُن کا گراں قدر کام ہے۔ رسالہ ''معاصر'' کے توسط سے وہ ادب کی مشاطگی کا کام بھی کرتے رہے اور معیاری ادبی صحافت کا نمونہ پیش کیا؛ لیکن کلیم الدین احمد کا اصل میدان تنقید نگاری ہی ہے، جس میں ان کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہو سکا۔

چند شعری ونثری تصنیفات

(۱) گل نغمہ۔۱۹۳۹ء

(۲) اردو شاعری پر ایک نظر۔۱۹۴۰ء

(۳) اردو تنقید پر ایک نظر۔۱۹۴۲ء

(۴) اردو زبان اور فن داستان گوئی۔۱۹۴۴ء

(۵) تحلیل نفسی اور ادبی تنقید۔۱۹۴۸ء

(۶) سخنہائے گفتنی۔۱۹۵۵ء

(۷) چار مقالے۔۱۹۵۸ء

(۸) دو تذکرے۔۱۹۵۹ء

(۹) تذکرہ دیوان جہاں۔۱۹۵۹ء

(۱۰) عملی تنقید۔۱۹۶۳ء

(۱۱) گلزار ابراہیم۔۱۹۷۴ء

(۱۲) دیوان جوشش عظیم آبادی۔۱۹۷۶ء

(۱۳) کلیاتِ شاد عظیم آبادی، جلد اوّل ودوم ۱۹۷۵ء اور جلد سوم: ۱۹۷۸ء

(۱۴) ''معاصر'' پٹنہ قاضی عبدالودود نمبر۔۱۹۷۶ء

(۱۵) مقالات قاضی عبدالودود۔۱۹۷۷ء

(۱۶) رقص شرر۔۱۹۷۷ء

(۱۷) میری تنقید ایک بازدید۔۱۹۷۸ء

(۱۸) ادبی تنقید کے اصول۔۱۹۷۹ء

(۱۹) اقبال ایک مطالعہ ۱۹۷۹ء

(۲۰) قدیم مغربی تنقید۔۱۹۸۳ء

(۲۱) میر انیس۔۱۹۸۸ء

(۲۲) فرہنگ ادبی اصطلاحات

(۲۳) اپنی تلاش میں، جلد اوّل ۱۹۷۵ء، جلد دوم ۱۹۸۷ء، جلد سوم: ۱۹۸۲ء

(۲۴) جامع انگلش اردو ڈکشنری (چھ جلدوں میں) جلد اوّل ۱۹۹۴ء، جلد دوم ۱۹۹۸ء، جلد سوم ۱۹۹۵ء، جلد چہارم ۱۹۹۷ء، جلد پنجم ۱۹۹۸ء، جلد ششم ۱۹۹۸ء وغیرہ۔

ایوارڈ وانعامات

(۱) غالب اِنسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے ''غالب ایوارڈ''۔۱۹۷۳ء

(۲) میر اکادمی لکھنؤ سے ''امتیازِ میر ایوارڈ''۔۱۹۸۰ء

(۳) حکومت ہند، نئی دہلی سے ''پدم شری ایوارڈ''۔۱۹۸۱ء

انتقال

(۱) ۲۱/دسمبر ۱۹۹۳ء کو بوقت ۷/بجے شام کرشنا پوری، پٹنہ میں واقع اپنے مکان میں انتقال ہوا۔

تدفین

(۱) ۲۲/دسمبر ۱۹۸۳ء کو بعد نماز عصر خواجہ کلاں محلّہ میں ان کے پرانے مکان کے باہری حصّے میں دفن کیا گیا۔

اسلم جاوداں
نائب مدیر سہ ماہی 'بھاشا سنگم'
اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

خواجہ الطاف حسین حالی کے بعد اردو تنقید کا دوسرا بڑا نام کلیم الدین احمد ہے۔ دونوں شاعر اور نقاد ہیں اور دونوں بہت خلوص کے ساتھ اردو شعر و ادب کو عالمی ادب کے معیار تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اردو ادب کی شناخت اس کی شاعری سے ہوتی رہی ہے؛ اس لیے دونوں نے سب سے پہلے اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس کی خامیوں کی جانب متوجہ کیا ہے۔ حالی کا مغربی ادب کا مطالعہ جس سطح کا بھی ہو، بہر حال انہوں نے اس سے استفادہ کیا اور اردو کو مغرب سے آشنا کیا۔ کلیم الدین احمد چوں کہ مغربی ادب پر نسبتاً زیادہ گہری نگاہ رکھتے تھے، انہوں نے بہت بے باکی اور سچائی کے ساتھ مغرب کے مقابلے میں اردو شعر و ادب کی سطحیت اور کم مائیگی کی جانب ہمیں متوجہ کیا۔ صنف غزل پر انہوں نے سخت ترین تنقید کی اور بے حد اہم شعرا کے سرمایے کو بھی سبک قرار دیا۔ ان کی باتیں چونکانے والی تھیں؛ اس لیے نہ صرف یہ کہ جہان تنقید میں خاصا ہنگامہ برپا ہوا؛ بلکہ مخالفین کا بھی ایک حلقہ وجود میں آ گیا۔ حمایت اور مخالفت نے کلیم الدین احمد کو ایک متنازعہ فیہ نقاد کی حیثیت سے متعارف کرایا؛ مگر زیادہ تر لوگوں نے اختلافات کے باوجود ان کی آرا کے خلوص، سچائی اور دیانت داری کا اعتراف کیا۔

کلیم الدین احمد کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی ان کی صاف گوئی، بے باکی اور سچائی ہے، جس کی وجہ سے دو تین کتابوں کی اشاعت کے بعد ہی وہ اردو کے مشہور ترین مصنف ہو گئے۔ بڑے بڑے لکھنے والوں کو انہوں نے متاثر کیا اور ادبی مباحث کے متعدد ابواب کھولے۔ پہلی نظر میں لوگوں کو ان کی رائے متعصّبانہ اور غیر صحت مند معلوم ہوتی؛ مگر بغور پڑھنے کے بعد وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے کہ یہ رائے کافی غور و خوض، وسیع مطالعے اور دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ شاعری کیا ہے؟ شعریت کیا ہے؟ تنقید کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟ ناقد کے لیے کون سے اصول ہونے چاہئیں؟ تنقید اور تحقیق میں کیا رشتہ ہے؟ ناول کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟ فکر و اسلوب میں اہمیت کسے دیں؟ جیسے زبان و ادب کے بنیادی مسائل پر انہوں نے بھرپور مثالوں اور دلائل کے ساتھ گفتگو

کی۔ انہوں نے متن کا گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا اور جو بھی نتیجہ پیش کیا، اسے مکمل طور پر مطمئن ہونے کے بعد ہی پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد کو اپنے نتائج اور آرا میں تبدیلی کی ضرورت کم ہی پڑی۔

کلیم الدین احمد اپنی تحریروں سے اردو شعر و ادب کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر کے اسے عالمی ادب کا ہم پلہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کی کوششیں اردو ادب کے لیے مفید ثابت ہوئیں اور آہستہ ہی سہی؛ مگر ایک انقلاب ضرور آیا۔ اشتراکی ادب کا جادو کم ہوا اور ادب کو صرف ادب کی کسوٹی پر جانچنے کا رجحان وجود میں آیا۔ تنقید میں تعریف و تحسین کے ساتھ ساتھ کوتاہیوں اور خامیوں کی گرفت کا حوصلہ پیدا ہوا اور ناقدین نے سیکھا کہ تنقید گول مٹول باتیں کہنے کا نام نہیں؛ بلکہ تجزیہ اور احتساب کے بعد سچائی کے ساتھ تعین قدر کا نام ہے۔ انہوں نے تنقیدی تحریروں کے لیے سادہ نثر کی وکالت کی اور محمد حسن عسکری، یا فراق گورکھپوری کی زبان کو نامناسب قرار دیا، چنانچہ تنقید میں آرائش، تصنع اور سجاوٹ سے پاک عام بول چال کی نثر لکھنے کا رجحان بڑھا۔

یہ محض ایسے چند نشانات ہیں جو کلیم الدین احمد کی اہمیت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الطاف حسین حالی کے بعد ایک مکمل ناقد صرف کلیم الدین احمد نظر آتے ہیں جن کے نقطۂ نظر اور طریقۂ کار سے اختلاف کے باوجود اردو کے تقریباً تمام بڑے ناقدین ان کی وسعت علمی، نکتہ سنجی، ذہنی پختگی اور شعر و ادب کی نباضی کے قائل رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب ایک مونوگراف ہے، کوئی تفصیلی اور تنقیدی کتاب نہیں۔ مونوگراف کے اپنے حدود ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد شخصیت اور اس کے ادبی و علمی کارناموں کا تعارف محض ہوتا ہے۔ اس میں تفصیلی تنقیدی مباحث قائم کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی؛ اس لیے زیر نظر مونوگراف کو بھی اسی نقطۂ نگاہ سے پڑھا جانا چاہیے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے ذریعہ کلیم الدین احمد کی زندگی اور ادبی خدمات کے تمام گوشے بیک نگاہ قاری کے سامنے آ سکیں۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر جناب امتیاز احمد کریمی اور اپنے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر اسلم جاوداں کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے کلیم الدین احمد جیسی نابغہ شخصیت پر مونوگراف لکھنے کے لیے مجھے اہل جانا اور ایک بڑی ذمہ داری عطا کی۔ میں ان کی توقعات پر کس حد تک پورا اتر پایا ہوں کہہ نہیں سکتا؛ مگر میں نے کوشش ضرور کی ہے کہ انہیں اپنے انتخاب پر افسوس نہ ہو۔

۱۰؍اکتوبر ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

کلیم الدین احمد: ایک نظر میں

نام : رحیم الدین عرف رحمو، بعد میں کلیم الدین احمد

تاریخ پیدائش : ۱۵؍ستمبر ۱۹۰۸ء

جائے پیدائش : خواجہ کلاں، پٹنہ سیٹی

والد کا نام : عظیم الدین احمد ابن سید شاہ واعظ الدین احمد

والدہ کا نام : نفیسہ خاتون

ابتدائی تعلیم : گھر پر

زیر نگرانی حافظ عبدالکریم وڈاکٹر عظیم الدین احمد (والد)

اسکول میں داخلہ : ۱۹۲۱ء، محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول، پٹنہ سیٹی

میٹرک : ۱۹۲۴ء، محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول، پٹنہ سیٹی

آئی اے : ۱۹۲۶ء، نیو انٹرمیڈیٹ کالج، پٹنہ

بی اے آنرز : ۱۹۲۸ء، پٹنہ کالج (انگریزی آنرز)

ایم اے : ۱۹۳۰ء، پٹنہ یونیورسٹی (انگریزی ادب)

شادی : ۱۹۲۸ء

اہلیہ کا نام : حنیفہ بیگم عرف حتی

اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ روانگی : ۱۷؍ستمبر ۱۹۳۰ء

وطن واپسی : ۱۹۳۳ء

(کیمبرج سے دو ٹرائی پوس حاصل کرنے کے بعد)

ملازمت : ۳۱؍اگست ۱۹۳۳ء

پٹنہ کالج میں انگریزی کے لکچرر

والدہ محترمہ کا انتقال : ۱۹۳۷ء

اہلیہ حنیفہ بیگم کا انتقال : ۱۹۳۷ء

گل نغمہ کی اشاعت : ۱۹۳۹ء

اردو شاعری پر ایک نظر کی اشاعت : ۱۹۴۰ء

دائرہ ادب کا قیام : ۱۹۴۰ء

رسالہ ''معاصر'' کا اجرا : ۱۹۴۰ء

دوسری شادی : دسمبر ۱۹۴۰ء

اہلیہ کا نام : زہرہ بیگم

اردو تنقید پر ایک نظر کی اشاعت : ۱۹۴۲ء

اردو زبان اور فن داستان گوئی کی اشاعت : ۱۹۴۴ء

ڈی پی آئی کا عہدہ : ۱۹۴۷ء

تحلیل نفسی اور ادبی تنقید کی اشاعت : ۱۹۴۸ء

والد گرامی کا انتقال : ۱۷؍مئی ۱۹۴۹ء

ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کا عہدہ : ۱۹۵۰ء

پٹنہ کالج کے پرنسپل کا عہدہ : ۱۹۵۲ء

(ساتھ ہی ڈین فیکلٹی آف آرٹس)

سخن ہائے گفتنی کی اشاعت : ۱۹۵۵ء

دوتذکرے جلد اوّل کی اشاعت : ۱۹۵۹ء

دوتذکرے جلد دوم کی اشاعت : ۱۹۶۳ء

اعزازی چیئرمین : ۱۹۶۴ء

بہار سکنڈری اسکول اکزامنیشن بورڈ

وائس چانسلر، بھاگلپور یونیورسٹی (۲/بار) : ۱۹۶۴ء

۴۲/نظمیں کی اشاعت : ۱۹۶۵ء

۲۵/نظمیں کی اشاعت : ۱۹۶۶ء

عملی تنقید کی اشاعت ۱۹۶۶ء

ملازمت سے سبکدوشی : ۱۴/ستمبر ۱۹۶۷ء

چیئرمین بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ ۱۵/ستمبر ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء

ڈائرکٹر خدابخش لائبریری، پٹنہ : ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۳ء

تاریخ نور کی اشاعت : ۱۹۷۳ء

غالب ایوارڈ : ۱۹۷۳ء

چیف ایڈیٹر جامع انگلش اردو لغت : ۱۹۷۴ء

اپنی تلاش میں، حصہ اوّل کی اشاعت : ۱۹۷۵ء

کلیات شاد، حصہ اوّل و دوم کی اشاعت : ۱۹۷۵ء

دیوان جوشش کی اشاعت : ۱۹۷۶ء

رقص شرر کی اشاعت : ۱۹۷۷ء

(محمد مسلم عظیم آبادی کا منتخب کلام)

مقالات قاضی عبدالودود حصہ اوّل کی اشاعت : ۱۹۷۷ء

میری تنقید ایک بازدید کی اشاعت : ۱۹۷۸ء

کلیات شاد، حصہ سوم کی اشاعت : ۱۹۷۸ء

ادبی تنقید کے اصول کی اشاعت : ۱۹۷۹ء

اقبال ایک مطالعہ کی اشاعت : ۱۹۷۹ء

اعزاز میر کی سند : ۱۹۸۰ء

نائب صدر، بہار اردو اکادمی : ۱۹۸۰ء

پدم شری کا خطاب : ۱۹۸۱ء

انتقال : ۲۱/دسمبر ۱۹۸۳ء، کرشنا پوری، پٹنہ

تدفین : ۲۲/دسمبر ۱۹۸۳ء

بہ مقام آبائی مکان، خواجہ کلاں، پٹنہ سٹی

❉

کلیم الدین احمد: شخصیت اور سوانح

کلیم الدین احمد کی پیدائش ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء کو (سرٹی فکیٹ کے مطابق ۱۹۰۹ء) شام ساڑھے چھ بجے محلّہ خواجہ کلاں، پٹنہ سیٹی میں ہوئی۔ ان کے والد پروفیسر عظیم الدین احمد پٹنہ کالج میں عربی وفارسی کے پروفیسر اور ایک ذی علم شخص تھے۔ بچپن میں کلیم الدین احمد کا نام رحیم الدین رکھا گیا تھا؛ اس لیے رحمو پکارے گئے؛ مگر بعد میں والد صاحب نے ان کا نام بدل کر کلیم الدین احمد کر دیا تھا۔ اسکول میں ان کا داخلہ اسی نام سے ہوا اور اردو دنیا میں اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام علیم الدین احمد عرف مالو تھا، جو اسی نام سے تاحیات جانے گئے۔ علیم الدین احمد کے بعد ایک بہن تھی، جس کا نام محمودہ عرف پھودی تھا، وہ انتہائی ذہین تھی؛ مگر اوائل عمر میں ہی کسی مرض کے باعث انتقال کر گئی۔ کلیم الدین احمد کی پیدائش بہن کے انتقال کے بعد ہوئی۔ والدین کے مطابق وہ صورت، شکل اور ذہانت میں بہن کی مانند ہی تھے۔

کلیم الدین احمد کے بڑے ابا فہیم الدین احمد کو کشتی، پنجہ کشی، ڈنڈ بیٹھک، موسیقی، گانا، پتنگ بازی، مرغ بازی اور شطرنج بازی وغیرہ کا بہت شوق تھا، ان کی خاص شفقت کلیم الدین احمد پر تھی؛ اس لیے ان ساری چیزوں سے کلیم الدین احمد کو بھی رغبت پیدا ہوگئی، چنانچہ اوائل عمر میں ہی انہوں نے گولیاں، گلی ڈنڈا، کبڈی اور فٹ بال کھیلے، ساتھ ہی کشتی، پتنگ بازی، تاش اور شطرنج بازی کا لطف بھی حاصل کیا؛ مگر مزاج کے اعتبار سے شرمیلے تھے؛ اس لیے بھیڑ بھاڑ والی جگہوں سے زیادہ تر دور

رہتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر اپنی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' میں یوں کرتے ہیں:

''اور میرے ڈر کا حال سنئے، ۱۹۰۹ میں ابا جان کو گورنمنٹ آف انڈیا سے اسٹیٹ اسکالرشپ ملی، وہ جرمنی سدھارے تھے۔۔۔ جب ہوش سنبھالا تو میں نے ابا جان کو نہ دیکھا۔۔۔ ایک روز صبح سویرے جو میں اٹھا تو دیکھا کہ گھر میں صفائی ہو رہی ہے، دعوت کا انتظام ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ولایت والے ابا جان گھر آ رہے ہیں، اندر باہر مہمانوں سے بھر گیا اور میری گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ زنان خانے کے دکھن جانب کچھ زمین تھی، جس میں کچھ پھل کے درخت لگے تھے اور گھاس اُگی ہوئی تھی، میں وہاں جا چھپا۔۔۔ میری کھلائی نے آخر مجھے کھوج نکالا۔ اس نے بہت کوشش کی ساتھ چلوں؛ لیکن میں روتا رہا''۔

(''اپنی تلاش میں''، جلد اول، ص: ۱۰-۱۱)

کلیم الدین احمد نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی؛ مگر جب والد محترم کو لاہور جانا پڑا تو گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ انہوں نے حافظ عبدالکریم سے تعلیم حاصل کی۔ اس دوران انہوں نے اردو کی پہلی، دوسری، تیسری کتاب، قاعدہ بغدادی اور قرآن شریف پڑھی اور آمد نامہ، گلستاں، بوستاں سے گزرتے ہوئے میزان، منشعب، صرف میر، نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو اور کافیہ وغیرہ کا درس حاصل کیا۔ انگریزی تعلیم کی ابتدا انہوں نے کنگ ریڈر سے کی، اس کے بعد اسکولی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ محمڈن اینگلو عربک اسکول کی چوتھی جماعت میں داخل کئے گئے، انگریزی کی تعلیم گھر پہ بھی پروفیسر محمد مسلم سے حاصل کرتے رہے۔

گھر میں ابتدا ہی سے ادبی ماحول تھا۔ والد، بڑے ابا، والد کے نانا کلیم پریشاںؔ، بڑے بھائی اور بڑے ابا کے دوستوں میں سے اکثر شاعری کرتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کلیم الدین احمد اسکول کے زمانے سے ہی غزلیں کہنے لگے، نظمیں بھی کہیں اور فارسی میں بھی شعر کہے؛ مگر اپنے شرمیلے مزاج کی وجہ سے کبھی محفلوں، یا مشاعروں میں نہیں پڑھ سکے، اکثر کلام وہ اپنے بھائی کو دے دیا کرتے تھے، اس زمانے میں انہوں نے عین الہدیٰ شمرؔ سے اصلاح بھی لی۔

کلیم الدین احمد کے ادبی اور علمی ذہن کی تعمیر میں ان کتابوں نے خاصا اہم کردار ادا کیا، جو انہیں بڑے ابا کی الماریوں سے ملیں۔ بڑے ابّا کے انتقال کے بعد جب انہوں نے زنان خانے میں رکھی دو الماریاں کھولیں تو وہ کتابوں سے بھری تھیں۔ ان میں سے اپنی پسند کے مطابق مطبوعہ اور مخطوطہ

کتابیں انہوں نے الگ کیں اور پڑھ ڈالا۔ دیوان حافظ کے علاہ میر، انشا، ذوق، مومن، داغ، امیر مینائی، رند، وزیر اور بحر کے دواوین۔ باغ و بہار، آرائش محفل، فسانہ عجائب اور نذیر احمد کی توبۃ النصوح جیسی نثری کتب۔ حافظ، امیر خسرو، بیدل، نظیری، صائب، مخفی کے فارسی دواوین۔ عربی کی ادبی کتابیں، قصائد، تفسیریں اور حدیثیں۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، لعل نامہ، تورج نامہ، بالا اختر، کوچک باختر وغیرہ۔ مگر انگریزی کی کوئی کتاب نہ تھی۔ وہابی تحریک کے متعلق تذکرہ صادقہ، تاریخ عجیب (مصنفہ جعفر تھانیسری) سے جانا اور رسائل تسعہ، صراط مستقیم، تقویۃ الایمان، تنبیہ الغافلین جیسی کتابیں بھی پڑھیں، ان رسائل کی انہوں نے بار بار ورق گردانی کی اور شعوری وغیر شعوری طور پر ان سے کافی متاثر ہوئے۔

۱۹۲۴ء میں کلیم الدین احمد نے میٹرک امتحان سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ ذہین اور اچھے طالب علم تھے؛ اس لیے اسکالرشپ بھی ملی؛ مگر دوسرے درجے میں پاس ہونے کا قلق رہا اور اپنے آپ میں کچھ زیادہ ہی سمٹ گئے۔ نیو کالج میں منطق، ریاضی اور عربی مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا؛ مگر انگریزی اور اردو بھی ساتھ ساتھ پڑھتے رہے۔ بڑے بھائی انگریزی سے ایم-اے کر رہے تھے۔ کلیم صاحب نے بھائی کی انگریزی کتابوں کا مطالعہ از خود کیا اور دلچسپی بڑھی تو اسکاٹ، آرنلڈ وغیرہ کو خاص توجہ سے پڑھا۔ والد صاحب کے زیر اثر جرمن فلسفے اور قرآن و حدیث میں دلچسپی پیدا ہوئی اور ان کا مطالعہ بھی کیا، خاص طور پر آرنلڈ کے اسلوب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ انگریزی اور اردو کے ادب پارے ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے؛ اس لیے غیر شعوری طور پر دونوں زبانوں کے ادب کا تقابل کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ منطق نصاب کا حصہ تھی؛ اس لیے اس پر بھی توجہ دی اور مزاج میں منطقی طرز استدلال کی بنیاد پڑ گئی۔ مطالعہ کلیم الدین احمد کا جنون تھا اور سامان تفریح بھی۔ یہی ایک عادت ہے، جو ان کے ساتھ تا عمر رہی۔ کم سخنی اور کم آمیزی کے باعث حلقہ احباب نہ کے برابر تھا؛ اس لیے کتابیں ہی ہر وقت رفیق و غم گسار بنی رہیں۔ بدر عظیم آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''اسکول کا زمانہ گزرا اور کالج کا دور آیا، اس وقت بھی کلیم میں کتابوں سے یہی لگاؤ رہا، صبح سو کر اٹھتے تو اغل بغل سے کتابیں اٹھاتے اور اپنے بستر پر ہی پڑے پڑے کتاب پڑھنا شروع کر دیتے۔ کالج کا وقت آتا تو منہ دھو کر ناشتہ کرتے؛ مگر کتاب ہاتھ سے نہ چھوٹتی، سہ پہر میں کالج سے واپس آتے تو پھر کتاب ہاتھ میں ہوتی''۔

(''حیات کلیم''، مرتبہ: سید محمد حسنین ص:۱۷)

غرض انہوں نے ہمیشہ کتابوں کی رفاقت کو لوگوں کی رفاقت پر ترجیح دی۔ حسن عسکری صاحب نے انہیں Ominivorous Reader کہا ہے۔ کالج وہ والد صاحب کے ساتھ جاتے اور کلاس شروع ہونے سے دو گھنٹہ پہلے پہنچ جاتے۔ یہ وقت لائبریری میں گزرتا، راستے میں بھی بگھی پر کوئی نہ کوئی کتاب زیر مطالعہ رہتی، نتیجہ یہ ہے کہ انٹرمیڈیٹ میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوئے اور ۱۹۲۸ء میں بی-اے آنرز انگریزی میں پٹنہ کالج کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی اوّل آئے، پھر انگریزی سے ۱۹۳۰ء میں ایم-اے کیا، جہاں پروفیسر ہل اور پروفیسر آرمر نے ان کی ذہنی و ادبی تربیت کی۔ ایم-اے سال آخر میں انہیں اسٹیٹ اسکالرشپ حاصل ہوئی، جس کی وجہ سے وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئے، ایم-اے میں انہیں گولڈ میڈل حاصل ہوا۔

لندن میں یونیورسٹی کالج میں انہوں نے داخلہ لیا؛ مگر سر سلطان کی مدد سے ایک ٹرم بعد ہی کیمبرج میں داخلہ مل گیا۔ کیمبرج میں انہوں نے ٹرائی پوس میں داخلہ لیا تھا۔ ان کے ہدایت کار ایف آر لیوس تھے، جن کے نظریات نے انہیں بے حد متاثر کیا، کیمبرج میں انہوں نے آئی اے رچرڈز، آرتھ کویلر کاؤچ، ای ایم فاسٹر وغیرہ کو براہ راست دیکھا اور سنا۔ یوں تو وہ کیمبرج کے بہت سارے اساتذہ سے فیضیاب ہوئے اور ذہنی دنیا وسیع ہوئی؛ مگر سب سے زیادہ اثر ایف آر لیوس کا قبول کیا۔ کیمبرج میں ۴۰ میں سے ۳۶ ٹیوٹوریل انہوں نے ڈاکٹر لیوس سے ہی لیے تھے۔ انگریزی میں ٹرائی پوس کے علاوہ انہوں نے گرینوبل یونیورسٹی سے فرنچ میں سمر کورس بھی کیا، درمیان میں ہی فرنچ ٹرائی پوس کیا اور جرمن، ہالینڈ، فرانس، بلجیم وغیرہ کا مشاہدہ بھی کیا، اس طرح ان کی نظر وسیع ہوئی اور شخصیت میں بھی کچھ حد تک کھلا پن پیدا ہوا۔

۱۹۳۳ء میں کلیم الدین احمد کیمبرج سے واپس آ گئے اور پٹنہ کالج میں لکچرر مقرر ہوئے۔ جون ۱۹۳۶ء میں انہیں پروفیسر شپ مل گئی۔ ۱۹۵۲ء میں پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے، اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں حکومت بہار کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن مقرر ہوئے، اس دوران وہ دو بار بھاگلپور یونیورسٹی کے عارضی وائس چانسلر بھی مقرر کئے گئے۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء سے ستمبر ۱۹۶۷ء تک بہار سکنڈری اسکول اکزامینیشن بورڈ کے اعزازی چیئرمین رہے۔ ۱۴ر ستمبر ۱۹۶۷ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۷ء سے ۱۷ر جنوری ۱۹۷۰ء تک بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ کے کل وقتی چیئرمین رہے، اس کے بعد فروری ۱۹۷۰ء سے اگست ۱۹۷۳ء تک خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے

ڈائرکٹر رہے۔۱۹۷۳ء میں انہیں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔۱۹۷۴ء میں وہ ترقی اردو بورڈ کے انگریزی اردو لغت بورڈ کے چیف ایڈیٹر ہوئے۔۱۹۸۰ء میں انہیں ''اعزاز میر'' کی سند سے نوازا گیا۔ جولائی ۱۹۰۸ء سے دسمبر ۱۹۸۲ء تک بہار اردو اکادمی کے نائب صدر کے فرائض انجام دیئے۔۱۹۸۱ء میں انہیں حکومت ہند کی جانب سے پدم شری کا خطاب ملا اور سارے ہندوستان نے ان کی تدریسی وادبی خدمات کا اعتراف کیا۔

بنیادی طور پر کلیم الدین احمد ایک بہترین استاد تھے۔انہوں نے تدریسی فرائض منصبی بہت اچھی طرح انجام دیئے۔۱۹۵۲ء میں جب وہ پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے تو کالج لائبریری، پورٹریٹ گیلری، پلے گراؤنڈ، باضابطہ کلاسیز، لکچرز کی افادیت، فلم سوسائٹی وغیرہ کی طرف انہوں نے کافی توجہ کی۔۱۹۵۶ء میں جب وہ بون ٹی بی کے باعث قریب سال بھر بستر پر رہے تو ذرا افاقہ ہوتے ہی انہوں نے اپنے بیڈروم میں کلاسیز لینا اور فائلیں دیکھنا شروع کر دیا، بستر پر لیٹے لیٹے ہی وہ آفس کی خبر بھی لیتے رہتے تھے۔وہ آرٹس فیکلٹی کے ڈین بھی رہے۔تدریس کے ساتھ ہی انتظامی امور میں بھی انہوں نے اپنی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔انگریزی کے پروفیسر ہوتے ہوئے انہوں نے اردو میں کئی طلبا واساتذہ کو بحیثیت نگراں پی ایچ ڈی اور ڈی لیٹ کرائی۔یہ ان کی ذہانت، قابلیت اور محنت کا ثبوت ہے۔ڈاکٹر سید محمد صدیق نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

> ''وہ ایک ممتاز اور نامور استاد کی حیثیت سے روشناس ہوئے۔انگریزی زبان وادب کے ایک اعلیٰ پروفیسر کے مرتبے پر برسوں رہ کر انہوں نے ذہنوں کی پرورش اور تہذیب کی۔وسیع اور گہرے مطالعے، قوت تنقید، پختہ شعور، تجزیاتی طریقۂ تدریس سے وہ اپنے طالب علموں میں ایک آئیڈیل استاد بنے رہے۔ایک طرف مطالعے کی وسعت اور گہرائی تھی تو دوسری طرف فرض شناسی، شفقت، علم اور پختگیٔ کردار تھی۔ایک استاد میں جب ایسی خوبیاں ہوں تو ظاہر ہے اس کی شخصیت کتنی تابناک اور منفرد ہوگی''۔

(''نذر کلیم''، ص:۵۳)

کلیم صاحب کو طلبہ سے والہانہ لگاؤ تھا۔انہوں نے طلبہ کی ذہنی وادبی تربیت کے لیے کئی قسم کی کوششیں کیں۔انہوں نے ''معاصر'' میں طلبہ کی تحریریں شائع کیں۔ Off the Record اور Current Studies نام کے دو پرچے نکالے۔پہلے میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور دوسرے

میں تبصرے، نظمیں، خاکے وغیرہ شائع ہوتے تھے۔خصوصاً طلبہ کی تخلیقات کو ان پرچوں میں ترجیحی بنیاد پر شامل کیا جاتا تھا۔ Off the Record کے ایڈیٹوریل بورڈ میں طلبہ کو بھی شامل کیا گیا۔ اس طرح کی کوششیں طلبہ اور نئے لکھنے والوں کی فکری وذہنی آبیاری میں معاون ثابت ہوئیں۔

بحیثیت ایڈمنسٹریٹر بھی کلیم الدین احمد بہت مقبول اور پسندیدہ افسر کی حیثیت سے جانے گئے۔بحیثیت ڈی پی آئی ان کا جو طریقۂ کار رہا، اس کے متعلق ایڈیشنل ڈی پی آئی رہے ایس ایم احمد نے بہت تفصیل سے لکھتے ہوئے یہ اقرار کیا ہے کہ کلیم صاحب نے اس تصور پر کاری ضرب لگائی کہ اچھے ٹیچرس اچھے ایڈمنسٹریٹر نہیں ہو سکتے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس عہدے پر تقریباً دس برسوں تک فائز رہے اور کامیاب وکامران افسر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔پرائمری تعلیم سے یونیورسٹی تعلیم تک ہر سطح پر وہ غور وفکر کے ساتھ مناسب ترین مشورے دیتے اور کسی کے دباؤ میں آ کر اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔ایس ایم احمد نے لکھا ہے کہ فائل میں ان کی نوٹنگ جامع، مختصر اور معنی خیز ہوتی تھی۔وزیر تعلیم اور حکومت کے ذریعہ تمام مباحث کے بعد ان کی جامع رائے کو ہی تسلیم کیا جاتا تھا۔اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کے ساتھ ان کا رویہ مشفقانہ وہمدردانہ ہوتا؛ مگر ان کے ذریعہ کی گئی کوتاہیوں، بے ایمانیوں اور رشوت خوری کو ہرگز برداشت نہیں کرتے تھے۔وہ اپنے ماتحتوں سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق آزادانہ کام لیتے؛ مگر ان پر گہری نظر بھی رکھتے تھے۔غرض اپنے تلامذہ، احباب اور رفقاء کار کے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ ہمدردانہ اور ایماندارانہ رہا۔

۲۲ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو بعارضہ قلب ۷ر بی کرشنا پوری میں کلیم الدین احمد کا انتقال ہو گیا۔بعد نماز ظہر کرشنا پوری میں مولانا مہدی رضا خان نے نماز جنازہ پڑھائی۔دوسری نماز خواجہ کلاں والے پشتینی مکان میں مولانا عبدالمغنی نے پڑھائی اور بعد نماز عصر خواجہ کلاں والے مکان کے بیرونی حصہ، جہاں ان کے والدین دفن ہیں، وہیں مدفون ہوئے۔

ذاتی، خاندانی اور سماجی احوال

کلیم الدین احمد نہایت کم آمیز، کم سخن اور خلوت پسند شخص تھے۔بھیڑ بھاڑ اور ہجوم سے ان کی طبیعت میں وحشت پیدا ہوتی تھی۔بچپن سے ہی شرمیلے اور کافی حد تک ڈرپوک واقع ہوئے تھے۔ کسی بھی اجنبی کو گھر میں دیکھ کر گھبرا جاتے اور کسی گوشے میں چھپ جاتے۔اس سلسلے میں کئی واقعات

پیش آئے، جن کا ذکر اپنی خودنوشت میں انہوں نے کیا ہے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا؛ مگر سخت گیری نہ تھی۔ مذہبی جلسے جلوس یہاں تک کہ تعزیہ، چھٹ پوجا اور دیوالی وغیرہ دیکھنے پر بھی کوئی روک نہ تھی۔ کھانے پینے کے زیادہ شوقین نہیں تھے۔ کبھی نشہ نہیں کیا، نہ ہی تمباکو، سگریٹ، پان، یا چلم کا شوق رہا۔ اپنے بڑے ابا اور والد کو خوب مئے نوشی کرتے اور اس کے برے نتائج بھگتتے دیکھ چکے تھے؛ اس لیے شراب سے نفرت سی ہوگئی۔ انہوں نے کبھی شراب نہیں پی۔ مزاج میں سنجیدگی، ایمانداری اور سچائی شامل تھی۔ جھوٹ اور بے ایمانی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ بچپن کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ امتحان میں نماز کے نمبر بھی ملتے تھے۔ کلیم الدین احمد چوں کہ نماز نہیں پڑھتے تھے؛ اس لیے ۴رنمبر کٹ جاتے۔ استاد نے کہا تم کہہ دو نماز پڑھتے ہو تو میں نمبر دے دوں گا؛ لیکن انہوں نے جھوٹ بولنا گوارا نہیں کیا۔ اسی طرح دیر رات تک سب تاش کھیل رہے تھے۔ ابو نے پوچھا تو سب نے کہا باتیں کر رہے تھے؛ مگر انہوں نے سچ بتادیا کہ تاش کھیل رہے تھے، تاش ضبط ہوئی؛ مگر ان سے جھوٹ نہ بولا گیا۔

جسمانی طور پر کلیم الدین احمد بہت تندرست نہ تھے؛ مگر ذہانت غضب کی تھی۔ ان کے ہم عصر اور پٹنہ کالج کے سابق پرنسپل پروفیسر اقبال حسین نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ:

''جب میں پٹنہ کالج میں طالب علم تھا اور علیم الدین احمد اور کلیم الدین احمد دونوں برادران بھی اسی کالج میں تھے، اس زمانے میں استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میری جسمانی طاقت میرے بڑے لڑکے علیم الدین احمد کو بخشی ہے اور میری دماغی قوت میرے چھوٹے بیٹے کلیم الدین احمد کو عطا کی ہے۔ یہ بات ان دونوں بھائیوں کے لیے آئندہ زندگی میں درست ثابت ہوئی۔ علیم الدین احمد کی زندگی محنت اور مشقت میں گزری۔ کلیم الدین احمد اس زمانے میں کیا؛ بلکہ تمام عمر کتاب کے کیڑے بنے رہے۔ جب دیکھو کتاب کا ساتھ ہے اور کسی سے بات کرنا بھی ان کے خیال میں امر لا حاصل تھا''۔

(''داستان میری''، ص:۴۶۰)

مذہبی اعتقادات کے لحاظ سے کلیم الدین احمد وہابی تھے؛ مگر بہت سخت گیر قسم کے نہ تھے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ مذہب کے منکر تھے؛ بلکہ کلام پاک پر ان کا مکمل یقین تھا۔ قاضی عبدالودود نے

ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''ایک بار نہیں بار بار میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ قرآن میں سب کچھ جو ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے موجود ہے۔ اگر کوئی بات اس میں نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو اس کے متعلق کامل آزادئ فکر و عمل حاصل ہے''۔

(''نذر کلیم''، ۱۹۷۴ء، ص:۵)

کلیم الدین احمد ایک جذباتی انسان تھے؛ مگر رومانیت اور عشق و محبت کے معاملے میں کبھی غیر سنجیدگی اختیار نہیں کی۔ لندن جانے سے قبل کم عمری ہی میں ان کی شادی ۱۹۲۸ء میں عبدالحفیظ صاحب کی منجھلی بیٹی حنیفہ بیگم سے کر دی گئی، جنہیں وہ حنی کہا کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ لندن کے لیے روانہ ہو گئے؛ مگر اس دو سال میں ان کی ازدواجی زندگی کچھ عجیب رہی۔ حنی شادی کے وقت ۱۴رسال کی تھیں اور کلیم صاحب کو بھی ازدواجی زندگی کے متعلق کوئی معلومات نہ تھی۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ شروع سے ان کی زندگی پیورٹین قسم کی رہی تھی اور کسی طرح کے جنسی محرکات نے انہیں متاثر نہیں کیا تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں دوست احباب بھی نہ کے برابر تھے کہ وہ ازدواجی زندگی کی واقفیت بہم پہنچا پاتے، لہٰذا عقد کے بعد کئی دنوں تک انہوں نے بیوی کو ہاتھ بھی نہ لگایا، کم سخن تھے ہی، بات چیت کی بھی نوبت نہ آتی۔ حنیفہ بیگم کی طبیعت بگڑی تو ان کی تیمارداری کے فرائض انجام دیتے ہوئے رفتہ رفتہ دوستی اور پھر محبت کے جذبات پیدا ہوئے، پھر بھی وہ جسمانی تعلق قائم نہ کر سکے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلے گئے۔ لندن میں انہیں والد صاحب کے ساتھ حنیفہ بیگم کے خطوط کا انتظار بھی رہتا تھا۔ ان کی بے چینی، انتظار اور جذباتی وابستگی کا اظہار ان کی ایک نظم میں ہوتا ہے، جو اس درمیان انہوں نے لکھی تھی اور جو ان کے مجموعے ''۴۲رنظمیں'' کی پہلی نظم ہے۔

کلیم الدین احمد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت کم سخن تھے اور تا حیات سادگی اور بلند نظری کے اصول پر کاربند رہے؛ مگر کبھی کبھی ان کے مزاج کی رنگینی اور طبیعت کی شگفتگی بے تکلف احباب کے درمیان عیاں ہو جاتی تھی، ان کے دوست پروفیسر اقبال حسین نے اپنی خودنوشت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''کلیم الدین آخر تک بظاہر زاہد خشک نظر آتے تھے؛ مگر اکثر اوقات رنگین مزاجی کا بھی ثبوت دینے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس سلسلہ میں مجھے دو ایسے واقعات یاد آ گئے

ہیں، جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آج سے تقریباً ۳۵ رسال قبل ہم لوگوں کے ایک دوست کی سالی اپنے جوڑے کو پھولوں سے سجائے ہم دونوں کے آگے سے جا رہی تھی کہ اتفاقاً ان میں سے ایک پھول گر پڑا، کلیم نے اسے اٹھانے کی فرمائش مجھ سے کی؛ لیکن میں ان کی فرمائش اس شرط پر پوری کرنے کو تیار ہوا کہ وہ جوڑے سے گرے ہوئے پھول کو اپنے بٹن ہول میں لگائیں۔ کلیم میری شرط پر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ دوسرا واقعہ بھی جو تقریباً ۲۵ رسال پہلے کا ہے، سن لیجیے۔ ایک دن کلیم اپنے بنگلے پر فلم ''بھوانی جنکشن'' کی نمائش کرنے والے تھے۔ جنوری کی انتہائی سرد رات تھی، موٹر بھیج کر مجھے پکڑ وامنگوایا، نمائش کے دوران میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا اور ان پر فلم کے ردعمل کا جائزہ لیتا رہا، چنانچہ میں نے دیکھا کہ وہ فلم کے رومانی مناظر سے بے حد لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ کلیم کی خشک طبیعت کے ریگستان میں کہیں کہیں رومانیت کا نخلستان بھی موجود تھا''۔

(''داستان میری''۔ ص:۴۶۱)

قیام لندن کے دوران بہت سی حسیناؤں سے سابقہ پڑا اور دعوت عیش بھی ملی؛ مگر کلیم صاحب کنارہ کر گئے۔ اس کا بڑا سبب ان کا پیوریٹین مزاج تھا، جس نے انہیں غیر ضروری تفریحات سے گریز کرتے ہوئے مطالعے تک محدود رکھا۔ واپسی کے بعد انہوں نے جنسیات سے متعلق کتابوں کا خود بھی مطالعہ کیا اور حنیفہ بیگم کو بھی اس تعلق سے چند معیاری کتابیں پڑھنے کو دیں۔ اس کے بعد ان کی ازدواجی زندگی مکمل ہوئی۔ بحیثیت شوہر کلیم الدین احمد نے اپنی زوجہ کا پورا پورا خیال رکھا اور ہمیشہ ان کی دلجوئی کی؛ مگر ترقی یافتہ اینگلوانڈین گھرانے کی حنیفہ بیگم کا دم صادق پور گھرانے کی پردہ داری میں گھٹنے لگا، اگرچہ انہوں نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا؛ مگر وہ اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہ کرسکیں۔ پہلی بچی کی ولادت کے بعد کمزور ہوتی گئیں، یہاں تک کہ دوبارہ حاملہ ہونے پر اسقاط حمل کے بعد وہ سنبھل نہ سکیں۔ کلیم الدین احمد کی والدہ جوان کا بہت خیال رکھتی تھیں کے انتقال نے بھی انہیں صدمہ سے دوچار کیا اور وہ بھی مالک حقیقی سے جاملیں۔ بیوی کی موت کا کلیم الدین احمد پر بہت اثر ہوا اور وہ اداس وملول رہنے لگے۔

حنیفہ بیگم کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد والد صاحب کے بہت زور دینے پر کلیم الدین

احمد نے اپنی بڑی سالی زہرہ بیگم سے نکاح کیا۔ زہرہ بیگم کافی پڑھی لکھی اور فعال خاتون تھیں۔ ان کے لیے صادق پور گھرانے کا ماحول مناسب نہ تھا؛ اس لیے کلیم الدین احمد والد صاحب کی ناراضگی کے اندیشے کے باوجود ایک الگ مکان میں منتقل ہو گئے۔ زہرہ بیگم کو یہاں پوری آزادی حاصل تھی، انہوں نے سیاست میں قدم بڑھایا اور مسلم لیگ، پھر کانگریس سے ایم ایل اے رہیں۔ کئی ویلفیئر بورڈ کی ممبر بھی نامزد کی گئیں۔ سیاست سے کلیم الدین احمد کو کبھی دلچسپی نہیں رہی؛ مگر اپنی بیوی کا ہمیشہ انہوں نے ساتھ دیا، سیاسی لوگ بھی کلیم الدین احمد کی بہت عزت کرتے تھے۔

کلیم الدین احمد کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹوں کا نام اظہر اور عارف تھا اور بیٹیوں کا نام فریدہ اور زائرہ تھا، بحیثیت والد انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت میں خوب دلچسپی لی اور اچھی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔

کلیم الدین احمد کی ادبی اور سماجی زندگی کا آغاز اوائل عمری ہی سے ہوا؛ کیوں کہ انہیں شاعری، شعر او رمقالہ نویسی وغیرہ سے دلچسپی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ پسندیدہ نظم اور غزل کو دو الگ الگ کاپیوں میں جمع کرتے تھے۔ ایک کاپی کا عنوان ''کشکول'' اور دوسری کا ''سبد گلچیں'' رکھا۔ ''کشکول'' میں تقریباً ۲۳۰ رغزلیں اور ''سبد گلچیں'' میں ۱۲۵ رنظمیں تھیں۔ اس عمل نے ان کی ذہنی تربیت کے علاوہ مطالعے کی وسعت کی طرف بھی گامزن کیا۔ دوران طالب علمی انگریزی کے مقالات بھی لکھے؛ مگر ۱۹۳۸ء میں رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد خود کو مصروف ومشغول رکھنے کی غرض سے ادبی زندگی کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے، اس کا آغاز انہوں نے والد عظیم الدین احمد کی نظموں کے مجموعے ''گل نغمہ'' کی ترتیب سے کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ''دائرہ ادب'' قائم ہوا اور 'معاصر' کی بنیاد ڈالی گئی۔ ان کے بیشتر رفقا مثلاً سید حسن عسکری، عبدالمنان بیدل، فضل الرحمٰن، اختر اورینوی وغیرہ جوان کے ساتھی اساتذہ بھی تھے، دائرہ ادب کے ارکان میں بھی شامل تھے۔

ان کی سماجی زندگی کا دائرہ بحیثیت ادیب، یا استاد روز بروز بڑھتا رہا، بحیثیت استاد وہ طلبا میں بہت مقبول تھے۔ متعدد لوگوں نے لکھا ہے کہ ان کے لکچر میں موضوع کے ساتھ بھرپور انصاف کیا جاتا تھا۔ وہ صرف نصاب ہی پورا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ موضوع کو کمال جامعیت کے ساتھ واضح کرتے تھے۔ طلبا کہتے تھے کہ ان کے لکچرز کے بعد امتحان کے لیے کسی اور مطالعے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس مقبولیت نے ان کا سماجی دائرہ کار بھی بڑھادیا اور وہ یونیورسٹی کالج کے مختلف امور میں

بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے؛ مگر قابل تعریف بات یہ ہے کہ وہ ہر عہدے پر فرائض ادا کرتے ہوئے تدریسی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوئے۔ان کے ادبی نظریات کے باعث مخالفین کی تعداد کثرت سے تھی؛ مگر ادبی اختلافات کو انہوں نے سماجی اخلاقیات پر کبھی حاوی ہونے نہ دیا۔ان کی کم آمیزی اور سنجیدگی کے باعث ان کے مخالف بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ان کی تصنیفات وتالیفات کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) گل نغمہ (مع مقدمہ)،۱۹۳۹ء۔مطبوعہ کے پی اگروال شانتی پریس، الہ آباد

(۲) اردو شاعری پر ایک نظر،۱۹۴۰ء۔ پہلا ایڈیشن

(۳) اردو شاعری پر ایک نظر (جلد اوّل)،۱۹۵۲ء۔بک امپوریم پٹنہ (دوسرا ایڈیشن)

(۴) اردو شاعری پر ایک نظر (جلد دوم)،۱۹۵۶ء۔ایوان اردو، پٹنہ

(۵) اردو تنقید پر ایک نظر،۱۹۵۷ء/۱۹۴۲ء۔دائرہ ادب، پٹنہ

(۶) اردو زبان اور فن داستان گوئی،۱۹۶۵ء/۱۹۴۶ء

(۷) تحلیل نفسی اور ادبی تنقید،۱۹۴۸ء۔ (انگریزی میں Psycho Analysis and literary criticism کے نام سے شائع ہوئی۔اردو ترجمہ ممتاز احمد کے ذریعہ ۱۹۹۰ء میں بہار اردو اکادمی نے شائع کیا۔

(۸) سخنہائے گفتنی،۱۹۵۵ء۔ادارہ فروغ اردو، لکھنو

(۹) تذکرۂ دیوان جہاں،۱۹۵۹ء۔مولفہ: بینی نرائن، مرتبہ: کلیم الدین احمد

(۱۰) دو تذکرے،۱۹۶۱ء۔تذکرہ شورش اور تذکرہ عشقی

(۱۱) عملی تنقید،۱۹۶۳ء۔اردو کتاب گھر، حیدر آباد

(۱۲) ۴۲/نظمیں،۱۹۶۵ء۔مکتبہ: طور، سبزی باغ، پٹنہ

(۱۳) ۲۵/نظمیں،۱۹۶۶ء۔مکتبہ: طور، سبزی باغ، پٹنہ

(۱۴) تذکرہ گلزار ابراہیم (جلد اوّل)،۱۹۶۸ء۔مولفہ: علی ابراہیم خاں خلیل

(۱۵) تذکرہ گلزار ابراہیم (جلد دوم)،۱۹۷۲ء۔مولفہ: علی ابراہیم خاں خلیل

(۱۶) تاریخ نور،۱۹۷۳ء۔دائرہ ادب، پٹنہ

(۱۷) اپنی تلاش میں (جلد اوّل)،۱۹۷۵ء۔کلچرل اکیڈمی، گیا

(۱۸) اپنی تلاش میں (جلد دوم)،۱۹۷۸ء۔ بہار اردو اکادمی، پٹنہ

(۱۹) اپنی تلاش میں (جلد سوم)،۱۹۸۲ء۔دائرہ ادب، پٹنہ

(۲۰) کلیات شاد (حصہ اول ودوم)،۱۹۷۵ء۔ بہار اردو اکادمی، پٹنہ

(۲۱) کلیات شاد (حصہ سوم)،۱۹۷۸ء۔ بہار اردو اکادمی، پٹنہ

(۲۲) رقص شرر،۱۹۷۷ء۔(مسلم عظیم آبادی کے کلام کا انتخاب)، بہار اردو اکادمی، پٹنہ

(۲۳) دیوان جوشش،۱۹۷۷ء۔مرتبہ: کلیم الدین احمد

(۲۴) مقالات قاضی عبدالودود،۱۹۷۷ء۔حصہ اوّل

(۲۵) میری تنقید ایک باز دید،۱۹۷۸ء۔خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

(۲۶) ادبی تنقید کے اصول،۱۹۷۹ء۔خواجہ غلام السیدین میموریل ٹرسٹ، دہلی

(۲۷) اقبال ایک مطالعہ،۱۹۷۹ء

(۲۸) قدیم مغربی تنقید،۱۹۸۳ء۔اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

(۲۹) میر انیس،۱۹۸۸ء۔ بہار اردو اکادمی، پٹنہ

(۳۰) انگریزی اردو جامع لغت،۹۸-۱۹۹۴ء۔ چھ جلدیں از ترقی اردو بیورو، دہلی

(۳۱) فرہنگ ادبی اصطلاحات اردو

(۳۲) Idols،۲۰۰۵ء (انگریزی)۔از خدابخش لائبریری، پٹنہ۔اس کا ترجمہ ''اصنام'' کے نام سے پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کیا۔

کلیم الدین احمد کے افکار ونظریات

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو کے پہلے نقاد ہیں، جنہوں نے اپنی تنقید میں بے لچک، غیر جانبدارانہ اور بے باک رویہ اپنایا۔انہوں نے تنقیدی خیالات کو انشاپردازی کے پردے میں چھپانے سے گریز کیا اور تنقید کے لیے صاف شفاف زبان کو ضروری بتایا۔اس کے علاوہ وہ محض نظری تنقید کے قائل نہیں رہے۔انہوں نے خود عملی تنقید کی اور تنقید کے لیے عملی تنقید کو ہی سب سے بہتر طریقہ قرار دیا۔کلیم الدین احمد کے تنقیدی رویے اکثر و بیشتر مغربی ادب کے مطالعے کا نتیجہ قرار دیئے جاتے رہے ہیں اور اسی بنا پر ان کی تنقید کو مغرب سے بے جا مرعوبیت کی مثال بھی بتائی گئی ہے۔ان کے مخالفین نے اسی بنیاد پر ایک مخالف محاذ قائم کیا اور انہیں مشرقی ادب اور مشرقی روایات سے ناواقف قرار دے کر منفی اور باطل تنقید کا علمبردار ثابت کرنے کی کوشش کی؛ مگر جب کلیم الدین احمد کی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ الزامات بہت حد تک غلط اور یک طرفہ مطالعے کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔کلیم الدین احمد نہ صرف مشرقی ادب اور مشرقی روایات سے واقف تھے؛ بلکہ مغربی ادب اور طرز تنقید کے مطالعے سے وہ اردو ادب اور تنقید کو ثروت مند، مفید اور بیش قیمت بنانا چاہتے تھے۔

گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ کلیم الدین احمد عظیم آباد کے ایک ذی علم، پڑھے لکھے

اور مشرقی قدروں کے امین خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی پرورش کی ابتدا مشرقی ماحول سے ہی ہوئی۔والد پروفیسر عظیم الدین احمد عربی و فارسی کے استاد تھے، شاعری کے علاوہ نثر میں بھی کئی وقیع مضامین و مقالات لکھ چکے تھے۔بڑے ابا شاعر تھے اور ان کا مجموعہ ''ولولے'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔والد کے نانا کلیم پریشان، بڑے بھائی مالو اور والد کے دوستوں میں اکثر شاعری کرتے تھے۔کلیم الدین احمد کی تعلیم کی ابتدا والد اور حافظ عبدالکریم کی دیکھ ریکھ میں ہوئی۔تین برسوں تک محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران انہوں نے تاریخ اسلام اور دیو مالا پڑھی۔اسی زمانے میں انہوں نے ''ٹیلز فرام رامائن'' اور ٹیلز فرام مہابھارت'' بھی پڑھیں۔اردو ادب کے تعلق سے ''آب حیات'' اور اقبال کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کیا۔فارسی میں انوری، خاقانی، عرفی، خسرو اور حافظ کا کلام ان کے زیر مطالعہ رہا۔شعر و ادب کے علاوہ گھر کی پرانی الماریوں سے انہوں نے متعدد کلاسیکی شعرا کے دواوین، نثر نگاروں کی داستانیں، علما و صوفیا کی مذہبی کتابیں اور تاریخی مخطوطات پڑھ ڈالے، جن کے اثرات کلیم الدین احمد پر شعوری اور غیر شعوری طور پر تاعمر قائم رہے۔کلیم الدین احمد پر مشرقی علوم اور شعر و ادب نے کتنا گہرا اثر ڈالا ہے، اس کا اندازہ ان کی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' کی جلد اوّل سے بہت اچھی طرح لگایا جاسکتا ہے۔اس میں انہوں نے مشرقی ادب اور اردو ادب سے اپنی وابستگی اور دلچسپی پر خاصی اچھی روشنی ڈالی ہے۔

اسکول کے زمانے میں انہوں نے پسندیدہ غزلوں اور نظموں کے لیے جو دو کاپیاں بنائی تھیں، اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ان کی خودنوشت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف شاعری کو پسند ہی نہیں کرتے تھے؛ بلکہ خود بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے لگے تھے۔مثلاً اس دور کے چند اشعار دیکھیے ۔

چلے آتے ہیں پیہم تیر ان کے میرے پہلو میں
مری خاموشیوں سے وہ مجھے غافل سمجھتے ہیں

دست تدبیر میں ہے اوج مقدر کی زمام
دل ہے کیوں خوں شدۂ گردشِ ایام ابھی

ننگ زیست ہے وہ دل درد سے جو گھبرایا
زندگی سے تنگ آیا ہے تو جا فنا ہوجا

اس کے علاوہ ایک مسدس کا بھی ذکر ملتا ہے، جو اس دوران انہوں نے لکھی تھی۔کلیم الدین احمد مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے؛ مگر بطور سامع۔انہوں نے خودنوشت میں دو تین مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے، جس میں معاصرانہ چشمک اور تنقیدی اعتراضات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔کلیم الدین احمد کو فکشن سے بھی دلچسپی تھی۔انہوں نے شرر، سرشار اور راشد الخیری کے ناولوں کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا۔شرر اور راشد الخیری کی تعریف میں مبالغے کو انہوں نے اس وقت بھی پسند نہیں کیا تھا، راشد الخیری کے یہاں غم کی زیادتی اور نمائش انہیں ناپسند تھی۔ناولوں میں سرشار کے ناولوں نے انہیں زیادہ متاثر کیا۔سرشار کی کردار نگاری اور منظر نگاری سے وہ متاثر ہوئے، جبکہ ناول ''کامنی'' کی تعمیری خوبیوں نے انہیں متاثر کیا۔

مذکورہ بالا امور کو خیال میں رکھ کر گفتگو کی جائے تو کلیم الدین احمد پر مشرقی ادب اور اردو ادب سے ناواقفیت کا الزام بے جا معلوم ہوتا ہے۔ان کی فکر کو نہ صرف مشرقی ادبی سرمائے نے متاثر کیا ہے؛ بلکہ وہ مشرقی شعر وادب پر خاصی نگاہ بھی رکھتے ہیں۔مشرقی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کی تربیت کی اور اردو شعر وادب پر گہری نظر نے تنقید کے لیے سرمایہ وقوت فراہم کیا۔

ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے انگریزی ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔فرنچ میں بھی ٹرائی پوس کیا۔مغربی ناقدین کے جن خیالات کو اردو کے نقاد کتابوں کے ذریعہ جانتے تھے، کلیم الدین احمد نے ان سے براہ راست استفادہ کیا۔ان سے لکچرز سنے، ٹیوٹوریلس لیے اور ان کی متعدد تصانیف کا سنجیدگی وگہرائی سے مطالعہ کیا۔ان اساتذہ اور ان کی تصانیف نے کلیم الدین احمد کے تنقیدی شعور پر اثر ڈالا اور انہوں نے اردو ادب کو مغربی ادب کا ہم پلہ بنانے کے لیے سخت اور بے لچک رویہ اپنایا۔

کلیم الدین احمد مغربی ناقدین میں سب سے زیادہ ایف آر لیوس سے متاثر ہوئے۔لیوس کیمبرج میں ان کے ہدایت کار تھے۔کلیم الدین احمد نے ان سے ۴۰ میں سے ۳۶ ٹیوٹوریلس لیے تھے۔آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ ''ایف آر لیوس کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں ادب کے معیاروں کے معاملے میں ایک سخت گیری ملتی ہے، جو مجموعی طور پر صحت مند ہے''۔کلیم الدین احمد نے اپنی خودنوشت میں ایف آر لیوس سے متعلق تفصیل سے لکھا ہے اور جگہ جگہ ان کی قابلیت کی تعریف کی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ان کا معیار بہت بلند تھا۔کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ سخت گیری کرتے ہیں؛لیکن وہ آرنلڈ کے اس قول پر عمل کرتے تھے ''Let Us Keep our standard high'' وہ نہایت آزاد خیال اور نڈر نقاد تھے اور تلخ سے تلخ بات کہنے میں انہیں ذرا بھی جھجک نہ ہوتی تھی''۔

(''اپنی تلاش میں''، جلد اول، ص:۲۰۰)

کہا جاتا ہے کہ کلیم الدین احمد کے یہاں تنقید میں بے باکی اور سخت گیری ایف آر لیوس کے ذریعہ ہی آئی۔لیوس اور کلیم الدین احمد کی زندگی اور کارناموں میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد کی نظر میں ان کے استاد اور نگراں آئڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔

ایف آر لیوس عملی تنقید کے قائل تھے، بقول کلیم الدین احمد ''لیوس کو عملی تنقید میں ید طولیٰ حاصل تھی''۔انہوں نے خودنوشت میں بیان کیا ہے کہ جب وہ ٹیوٹوریلس کے لیے جاتے تھے تو لیوس ایک ایک نظم کا تجزیہ کرتے اور عملی تنقید کے طریقہ کار کو پسند کرتے تھے۔بقول کلیم الدین احمد:

''کیمبرج میں عملی تنقید پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی جو کسی اور یونیورسٹی میں نہیں ہے۔عملی تنقید کے ساتھ نظریاتی تنقید ارسطو سے لے کر زمانہ حال تک۔اس پرچے سے مجھے خصوصی دلچسپی تھی۔ڈاکٹر لیوس کی وجہ سے یہ دلچسپی اور بڑھ گئی تھی''۔

(''اپنی تلاش میں''، جلد دوم، ص:۱۴۴)

اس کے علاوہ تاریخی شعور، روایت کا تحفظ، شاعری اور سائنس، اخلاقیات اور فن وغیرہ کے متعلق ایف آر لیوس کے نظریات کا عکس بھی کلیم الدین احمد کی تحریروں میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے؛ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ کلیم الدین احمد کی تنقید اور افکار کو ایف آر لیوس اور ان کی تحریروں نے بہت متاثر کیا ہے۔

کلیم الدین احمد لندن میں جس دوسرے ناقد سے متاثر ہوئے، اس کا نام آئی اے رچرڈز ہے۔انہوں نے رچرڈز کے لکچرز سنے اور ان کے انداز بیان اور طریقۂ نقد سے متاثر ہوئے۔رچرڈز خشک موضوعات کو بھی مختلف طریقوں سے دلچسپ بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ان کی تنقید نظریاتی اور عملی دونوں ہوتی تھی؛ مگر علم نفسیات کے حوالے زیادہ ہوتے تھے؛ اس لیے کلیم الدین احمد رچرڈز کے تجزیاتی طریقۂ نقد کی تعریف کرتے ہوئے علم نفسیات کی بے اعتدالی کو نشانہ بھی بناتے ہیں۔

''رچرڈز بھی بہت اچھی اور گہری تجزیاتی تنقید کرتے ہیں؛لیکن کبھی کبھار نفسیاتی پہلو،ادبی پہلوکوپس پشت ڈال دیتاہے''۔

(''اپنی تلاش میں''،جلد دوم،ص:۱۶۹)

دراصل رچرڈز کا نفسیات پر زور غلو کی حد تک جا پہنچتا ہے۔کلیم الدین احمد بھی نفسیات سے مدد لینا ادب کے لیے مفید سمجھتے ہیں؛مگر اس میں اعتدال اور توازن قائم رکھنا ضروری بتاتے ہیں۔بقول کلیم الدین احمد:

''ہمیں نفسیات سے مفید نکتے مل سکتے ہیں۔اس سے بصیرت میں گہرائی آتی ہے،بشرطیکہ نقاد کی دلچسپی ادبی رہے،محض نفسیاتی نہ ہوجائے''۔

(''اردو تنقید پر ایک نظر''،ص:۳۶)

رچرڈز کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے کے لیے ان کی تصانیف ادبی تنقید کے اصول،عملی تنقید اور شاعری اور سائنس مفید ثابت ہوتی ہیں۔کلیم الدین احمد کی دو کتابوں کے عنوان رچرڈز کی ہی مذکورہ کتابوں سے لیے گئے ہیں۔رچرڈز نے بھی مختلف موضوعات پر گفتگو کی ہے۔مثلاً ادب اور سائنس، شاعری کی اہمیت، قدروں کی نفسیات، سائنٹفک زبان، ادب کی تفہیم کا طریقہ کار اور جمالیاتی تنقید وغیرہ پر انہوں نے خصوصی توجہ دی ہے۔کلیم الدین احمد، رچرڈز کے نظریاتی اور عملی طریقہ نقد سے متاثر ہیں؛مگر اپنی تنقید کو نفسیاتی بے اعتدالی سے بچا لیتے ہیں۔وہ رچرڈز کے سائنسی طریقہ کار اور تجزیاتی تنقید سے متاثر ہیں اور استفادہ کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ٹی ایس ایلیٹ تیسرا نام ہے جس کا اثر کلیم الدین احمد پر ہوا۔ان سے براہ راست استفادہ کا موقع تو نہیں ملا؛مگر ان کی تحریروں اور ایف آر لیوس کے توسط سے وہ ایلیٹ سے خاصے متاثر ہوئے۔ایلیٹ کو سراہتے ہوئے کلیم الدین احمد رقمطراز ہیں:

''یوں تو ایلیٹ نے بھی کبھی کبھار بہت اچھی تجزیاتی تنقید کی ہے جیسے Andrew MA کی مشہور نظم To A coy mistress کی؛لیکن ایلیٹ کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ ایک دو جملوں میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں، جو دوسروں کی کتابوں سے زیادہ وزنی ہیں اور جن کی تشریح کے لیے ایک کتاب چاہیے''۔

(''اپنی تلاش میں''،جلد دوم،ص:۲۰۰)

ایلیٹ کی تنقید میں تین نمایاں اوصاف ملتے ہیں۔کلاسیکی انداز، ادبیت پر نگاہ اور روایت کا شعور۔ان تینوں اوصاف سے ان کی تنقید میں کلاسیکی رنگ پیدا ہوجاتا ہے۔ایلیٹ کے نزدیک کلاسک کا ایک خاص مفہوم ہے، جس سے وہ معیار اور عظمت اور پختگی مراد لیتے ہیں۔بقول ایلیٹ:

''اگر کوئی لفظ ایسا ہے،جس میں ''کلاسک'' کی اصطلاح کی ساری خصوصیات یکجا ہوسکتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ مفہوم کا اظہار کرسکتا ہے تو وہ لفظ ''کاملیت'' یا پختگی ہے''۔

(''ایلیٹ کے مضامین''،از:جمیل جالبی۔ص:۱۹۶)

یعنی ایلیٹ نے کامل اور معیاری تخلیق کو ''کلاسک'' کا نام دیا ہے اور یہ کاملیت ، یا پختگی حاصل کرنے کے لیے تاریخی شعور ضروری ہے۔ایلیٹ کے بقول تاریخی شعور کا یہ مطلب ہے کہ شاعر اپنی قوم کی تاریخ سے پوری طرح واقف ہو، یا کسی انتہائی مہذب قوم کی تاریخ کا اسے علم ہو۔ظاہر ہے ایسے کلاسیکی ادب کے لیے جہاں مختلف قسم کی صلاحیتیں اور جوہر ضروری ہیں، وہیں ایسی زبان بھی ضروری ہے، جس میں یہ سارے جوہر سما سکیں، چنانچہ اسی خصوصیت کے پیش نظر ایلیٹ نے لفظ ''جامعیت'' کا اضافہ کیا ہے۔وہ جامعیت جو فن پارے کو آفاقی بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔وہ کہتے ہیں:

''جب ادب پارہ اس جامعیت سے آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرے غیر ملکی ادبیات کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہوجاتا ہے، جتنا خود اپنی زبان کے لیے تھا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں آفاقیت بھی موجود ہے''۔

(''ایلیٹ کے مضامین''۔ص:۲۱۷)

کلیم الدین احمد کی تنقید میں آفاقیت پر زور ایلیٹ کے اسی نظریے کی وجہ سے ملتا ہے؛ بلکہ وہ آفاقیت پر بات کرتے ہوئے ایلیٹ سے چند قدم آگے بڑھ جاتے ہیں؛ کیوں کہ ایلیٹ مقامیت کے تحفظ پر زور دیتا ہے، وہ شاعری کے ذریعہ قوم کی زبان کو ترقی دینا چاہتا ہے؛ مگر کلیم الدین احمد ایسے تجربات کو ادب کا موضوع بنانا چاہتے ہیں، جن میں ابدیت ہو اور جو زمان ومکان کی حدوں سے پرے ہوں۔ایک ملک، قوم یا دور میں ہی نہیں، ان کی افادیت مختلف اقوام اور مختلف ادوار تک قائم رہے۔

ایلیٹ کی تنقید کا دوسرا اہم وصف ہے روایت کا تتبع۔انہوں نے روایت کو خاصی اہمیت دی ہے؛ مگر وہ روایت نہیں، جو بغیر محنت وریاضت کے محض اتباع سے حاصل ہوئی ہو۔انہوں نے اس

روایت کا اتباع اہم بتایا ہے، جس کی بنیاد تاریخی شعور پر ہو اور جس کا سلسلہ مربوط طور پر ''حال'' سے بھی ملتا ہو۔ کلیم الدین احمد نے بھی تقریباً ایسی ہی بات کہی ہے کہ جب تک ادبی تاریخ، ادبی وراثت کو نگاہ میں نہیں رکھا جاتا، شعر و ادب کے معیار اور اہمیت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

ایلیٹ کی تنقید کا تیسرا وصف ادب کا مطالعہ بحیثیت ادب ہے؛ یعنی ان کی نگاہ میں ادب کے معیار کی پرکھ، یا ادب کا عدم، یا وجود صرف ادبی معیاروں سے ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے بھی ہمیشہ اسی نظریے پر زور دیا ہے کہ ادب کو پرکھتے ہوئے کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ ادب ہے اور اس کے تقاضے ادبی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:

''غلط خیال سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کبھی یہ نہ بھولیں کہ شاعری شاعری ہے، کوئی اور چیز نہیں''۔

(''ادبی تنقید کے اصول''۔ ص:۳۰)

اس کے علاوہ تنقید، شعر، الفاظ، اسلوب، وزن، آہنگ، لہجہ وغیرہ کے متعلق ایلیٹ کے خیالات سے کلیم الدین احمد خاصے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے تجزیاتی طریقۂ نقد اور کم لفظوں میں بڑی بات کہنے کے ہنر پر بھی غور کیا جائے تو واضح طور پر ایلیٹ کے اثرات دکھائی دے جاتے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے انگریزی کے علاوہ فرنچ میں بھی ٹرائی پوس کیا تھا۔ اس زبان کو انہوں نے جن اساتذہ سے سیکھا تھا، ان میں مسٹر گریس Mr.Grace خاص ہیں۔ اس کے علاوہ Mr.Preior weford سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ مغربی ناقدین میں ازرا پاؤنڈ سے وہ متاثر ہوئے اور آرنلڈ کے اس قول کو بھی دہراتے رہے کہ ''Let us keep our standard high''۔ کولرج کے نظریہ تخیل کی تعریف کی تو شیکسپیئر کے نظریہ ''تخیل'' کو بھی سراہا۔ گویا کلیم الدین احمد مشرقی اور مغربی ادب دونوں سے کم و بیش یکساں طور پر استفادہ کرتے ہیں اور دونوں کی روشنی سے اپنے خیالات کو استدلال و استحکام عطا کرتے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے اپنی تنقید میں ادب، شاعری، شعریت، شاعری کی اہمیت، تنقید اور تنقید کے اصول، نقاد کی خوبیاں، تنقید کے شرائط اور اغراض و مقاصد پر جا بجا جو گفتگو کی ہے، اس میں مشرق و مغرب دونوں کے افکار و نظریات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نظریاتی تنقید پر باضابطہ یک موضوعی کتاب نہیں لکھی؛ مگر ان کے مضامین اور بالخصوص عملی تنقید میں جا بجا ایسے نظریاتی

مباحث ملتے ہیں، جن سے ادب کے بنیادی مسائل کے متعلق کلیم الدین احمد کے افکار و نظریات کسب کئے جا سکتے ہیں۔

کلیم الدین احمد ادب اور شاعری کو بیش قیمت تجربات کا موزوں ترین اظہار قرار دیتے ہیں۔ وہ تجربہ جس کی بنیاد خلوص اور سچائی پر ہو، شعر میں ڈھل کر ہی مکمل ہوتا ہے۔ انہیں افسوس ہے کہ مشرق و مغرب دونوں جگہ شاعری کو اس کا اصل مقام نہیں حاصل ہوا، جو صنف انسانی کامرانی کی معراج اور انسانی سماج و تہذیب کے سر کا تاج ہے، اسے محض دل بہلانے کا ذریعہ سمجھا گیا۔ ان کی نگاہ میں شاعری سائنس اور فلسفے سے بھی برتر ہے؛ کیوں کہ یہ نہ صرف اعلیٰ تجربات اور حقائق سے روشناس کراتی ہے؛ بلکہ اسرار الٰہی کو بے نقاب کرتی ہے۔

کلیم الدین احمد شعر کو ایسی وحدت قرار دیتے ہیں، جس میں مضمون اور الفاظ الگ الگ نہیں ہوتے؛ بلکہ ایک ہو کر ایک نئی چیز، نیا تجربہ اور نئی حقیقت عطا کرتے ہیں۔ تنقید کے لیے ان دونوں کو الگ کر کے دیکھنا پڑتا ہے؛ تاکہ فکر اور اسلوب کی خوبیاں واضح کی جا سکیں۔ وہ شعر کے بجائے قطعات اور نظموں کو نسبتاً زیادہ وسیع سمجھتے ہیں کہ ان میں نقوش کو پھیلنے پھولنے کا موقع زیادہ ملتا ہے؛ مگر ساتھ ساتھ وہ الفاظ کو بھی اہم بتاتے ہوئے انہیں ادب کا میڈیم قرار دیتے ہیں۔ گویا کلیم الدین احمد کے نزدیک اچھا شعر نقوش، الفاظ، آہنگ یا وزن اور لب و لہجے کے خوب صورت امتزاج اور ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ ہم آہنگی وہی شاعر پیدا کر سکتا ہے، جس کی قوت حاسہ تیز اور قوت تخیل بلند ہوتی ہے؛ اسی لیے کلیم الدین احمد شاعر کو ایک غیر معمولی انسان خیال کرتے ہیں۔

فن تنقید کے تعلق سے بھی کلیم الدین احمد کے نظریات مشرق و مغرب کے دونوں سرچشموں سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ عملی تنقید کے مقدمے میں انہوں نے تنقید کے اصولوں کے تعلق سے جو مفصل بحث کی ہے، یا اردو تنقید پر ایک نظر، سخن ہائے گفتنی اور اردو تنقید کے اصول میں شعریت، تنقید وغیرہ پر جو گفتگو کی ہے، ان میں پیش کردہ کلیم الدین احمد کے نظریات پر مشرق و مغرب کے مختلف شعرا و ناقدین کے افکار کی جھلک بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

کلیم الدین احمد کے نزدیک تنقید اور ادب میں ایک گہرا رشتہ ہے۔ تنقید ادب کی پیروی کرتی ہے، ادب سے الگ ہو کر تنقید زندہ نہیں رہ سکتی۔ ادب پہلے وجود میں آتا ہے، تنقید بعد میں؛ کیوں کہ ادبی کارناموں سے ہی نقاد اصول فن اخذ کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید ایک مشکل ترین فن

ہے، جس کی بنیاد اصولوں اور ضابطوں پر ہے۔ نقاد کو تنقید کے تمام پہلوؤں سے واقف ہونا چاہیے۔ اس کے پاس لطیف قوت حاسہ اور وسیع فکر ونظر ہونی چاہیے۔

نقاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اور دیگر تمام اہم ادبی ذخائر پر نگاہ رکھے اور اچھے ادب سے تاثر قبول کرے؛ تاکہ اس کا بروقت استعمال کر سکے۔ انہیں احساس ہے کہ ادب زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے الگ نہیں ہے؛ اس لیے وہ نقاد کے لیے علم کے مختلف شعبوں کے بہترین خیالات سے آگہی ضروری قرار دیتے ہیں، مثلاً نفسیات، سائنسی طریقۂ کار، الفاظ پر قدرت اور تقابلی صلاحیت وغیرہ۔ دیگر علوم اور سائنس سے نقاد کی واقفیت نقاد کے تنقیدی نقطۂ نظر کو وسعت عطا کرتی ہے اور کھرے کھوٹے میں پہچان کرنا سکھاتی ہے۔ ان کی نگاہ میں نقاد ایک منصف ہے، جو فن پارے کو پرکھتا ہے اور فیصلے صادر کرتا ہے۔

کلیم الدین احمد نے ادب کی آفاقیت پر زور دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کچھ بنیادی قدریں دنیا کے سارے ادب میں یکساں ہوتی ہیں اور وہی اسے اعلیٰ درجہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ زندہ رکھتی ہیں؛ اس لیے کسی زمانے کا ادب دوسرے زمانے میں ضائع نہیں ہوتا۔ ادب آفاق گیر ہوتا ہے اور ہر جگہ یا ہر دور کے انسان کے بنیادی احساسات سے وابستہ ہوتا ہے۔ ادب کو کسی نظریے یا ازم کے بجائے ادبیت کے معیار سے پرکھنا چاہیے اور وہ معیار، یا پیمانہ ہر جگہ یکساں ہونا چاہیے۔ ترقی پسندوں سے انہیں یہی شکایت تھی کہ انہوں نے ادب کو ادب کے بجائے پروپیگنڈہ بنا دیا تھا۔ انہیں ادب میں پیغام کی موجودگی سے شکایت نہیں، وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ادب میں پہلے ادبیت ہونی چاہیے، پیغام یا نظریہ بعد میں۔

کلیم الدین احمد نے تاثراتی تنقید، لچھے دار اسلوب اور نمائشی فقروں کو ادب کی جانچ پرکھ کے لیے مہلک قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق تنقیدی تحریر صاف، شفاف اور عبارت آرائی سے پاک ہونی چاہیے؛ تاکہ کسی طرح کی غلط فہمی جگہ نہ پا سکے۔ انہوں نے خود بھی ایسی نثر لکھی، جس میں قطعیت ہے ابہام و اہمال نہیں۔

کلیم الدین احمد کے یہ خیالات ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے نظریاتی تنقید پر بھی خاصی گفتگو کی ہے اور مشرق و مغرب کے وسیع مطالعے کے بعد جو رائے دی ہے، اس میں توازن، وسعت اور بصیرت موجود ہے۔ انہوں نے اپنے نظریات کی پیش کش میں انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا؛ بلکہ جو کچھ کہا، اسے منطقی دلائل اور شواہد سے مزین کر کے پیش کیا۔

کلیم الدین احمد کی تنقیدی خدمات

کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کا آغاز ''گل نغمہ'' سے ہوتا ہے۔ ''گل نغمہ'' ان کے والد پروفیسر عظیم الدین احمد کی نظموں کا مجموعہ ہے، جسے انہوں نے ترتیب دے کر اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس مقدمے کے دو حصے تھے: ایک اردو شاعری سے متعلق اور دوسرا شامل کتاب نظموں سے متعلق۔ یہ نظمیں انگریزی نظموں کے زیر اثر لکھی گئی تھیں؛ اس لیے ان میں وہی خوبیاں تھیں، جو انگریزی نظموں میں پائی جاتی ہیں۔ کلیم الدین احمد نے نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے غزل کے تعلق سے چند متنازعہ باتیں کہیں، جس میں وہ مشہور جملہ بھی تھا ''غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے''۔ جس کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا کہ غزل ربط، اتفاق، تکمیل سے مبرا ہوتی ہے۔ غزل میں چند مختلف المعانی اشعار اکٹھا کر دیئے جاتے ہیں، اس میں ارتقائے خیال نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ انہی امور کی بنا پر غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ لفظ ''نیم وحشی'' پہ جو ہنگامہ بپا ہوا، اس نے نہ صرف ناقدین کو بلکہ خود کلیم الدین احمد کو اردو تنقید کی جانب سنجیدگی سے متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں یہی مقدمہ اختصار کے ساتھ ان کی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں بھی شائع ہوا۔

اس مقدمے سے ایک الزام کلیم الدین احمد پر یہ بھی لگا کہ وہ انگریزی کے طالب علم ہیں، اردو ادب سے واقفیت حاصل نہیں؛ اس لیے اردو شعر و ادب کو بھی انگریزی عینک سے ہی دیکھتے ہیں، حالانکہ ان کی بعد کی تمام تحریریں اس الزام سے انہیں بہت حد تک مبرا کر دیتی ہیں۔ یہ صحیح ہے

کہ کلیم الدین احمد انگریزی کے استاد تھے، انگریزی ناقدین سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا؛ مگر ان کا اردو فارسی شعر و ادب کا مطالعہ بھی خاصا وسیع تھا۔ گذشتہ صفحات میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ وہ اسکول، کالج کے زمانے میں ہی تاریخ اسلام، ہند دیو مالا اور عربی و فارسی کی منتخب کتابیں پڑھ چکے تھے۔ گھر میں ادبی ماحول تھا۔ والد، بڑے ابا، نانا، بڑے بھائی، والد اور بڑے ابا کے دوستوں میں اکثر شاعری کرتے تھے۔ میرؔ، انشاؔ، ذوقؔ، مومنؔ، داغؔ، امیر مینائیؔ، رندؔ، وزیرؔ، بحرؔ کے دواوین کے علاوہ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، توبۃ النصوح، لعل نامہ، تورج نامہ، بالا باختر، کوچک باختر، داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا وغیرہ کے مطالعے سے ان کا ادبی شعور مستحکم ہوا تھا۔ دیوان حافظ کے علاوہ، خاقانیؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، صائبؔ، بیدلؔ اور خسروؔ کی شاعری نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی تھی۔ مذہبی کتابوں میں بھی وہ تذکرۂ صادقہ، تاریخ عجیب، رسائل تسعہ، تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم وغیرہ سے خاصے متاثر ہوئے تھے۔ کالج میں بطور خاص انھوں نے عربی مضمون منتخب کیا تھا۔ گویا مشرقی ادب کا نہ صرف مطالعہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا؛ بلکہ مشرقی ادب ان کی دلچسپی کا محور بھی رہا تھا۔ اس طرح یہ کہنا غلط ہوگا کہ کلیم الدین احمد مشرقی شعر و ادب پر نظر نہیں رکھتے تھے اور مغربی اصولوں کے آئینے میں ہی نتیجہ اخذ کیا کرتے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ جہاں مشرقی شعر و ادب ان کی فکر کا سرچشمہ رہا، وہیں مغربی ادب اور اصول تنقید بھی ان کے فکر و شعور اور تنقیدی بصیرت کی بنیاد بنے؛ اس لیے ان کی تنقید پر مشرقی اور مغربی خصوصاً انگریزی تنقید کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسا ہونا فطری بھی ہے؛ کیوں کہ انھوں نے اسکول کالج کی زندگی میں جہاں مشرقی ادب کا زیادہ مطالعہ کیا وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگریزی ادب کا انتخاب کیا۔ فرنچ میں بھی ٹرائی پوس کیا۔ لندن میں براہ راست انھوں نے مغربی ناقدین سے استفادہ کیا۔ Levis F.R سے ٹیوٹوریلس لیے، I.A.Recherds کے لکچرز سنے، TS.Eliot کی تصنیفات زیر مطالعہ رہیں اور ازرا پاؤنڈ، کولرج، شیکسپیئر اور میتھو آرنلڈ وغیرہ کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان مغربی ادیبوں اور مفکرین نے کلیم الدین احمد کے تنقیدی شعور پر ضرور اثر ڈالا ہوگا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کلیم الدین احمد مشرقی ادب اور مغربی ادب دونوں سے ہی نہ صرف واقفیت رکھتے تھے؛ بلکہ ان پر کم و بیش یکساں انھیں دسترس بھی حاصل تھی؛ اس لیے مشرقی و مغربی دونوں ادب، دونوں کے اصول و نظریات اور دونوں کے طریقہ نقد کے اثرات کلیم الدین احمد کی تنقید پر پائے جاتے ہیں۔ انھیں

مغربی نقاد، یا مشرق سے ناواقف نقاد قرار دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ ان کی تنقید میں توازن، وسعت، بے باکی اور بصیرت دونوں ادب کے مطالعے سے پیدا ہوئی۔ ذیل میں ان کی تنقیدی نگارشات کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اردو شاعری پر ایک نظر: (حصہ اوّل)

''اردو شاعری پر ایک نظر'' ''گل نغمہ'' کے مقدمے کے بعد ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ''گل نغمہ'' میں پیش کردہ خیالات کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ ''گل نغمہ'' میں کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا اور اس کی وجہ پراگندگی اور ریزہ خیالی بتائی تھی۔ ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں یہی خیال ان کے تمام تنقیدی مباحث کی بنیاد بنا رہا۔ حصہ اوّل میں جو تنقیدی مباحث پیش کئے گئے ہیں وہ تمہید، غزل، قطعہ، میرؔ، دردؔ و سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، قصیدہ ہجو، سوداؔ و ذوقؔ، مثنوی، میر حسنؔ، نسیمؔ، شوقؔ، مرثیہ، انیسؔ و دبیرؔ، متفرق اصناف، خاتمہ اور ضمیمہ نظیرؔ اکبر آبادی پر مشتمل ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے حصے میں شاعری کی ماہیت، ضرورت اور اصناف شاعری پر تنقید کی گئی ہے اور اسی کی روشنی میں نمائندہ شعراء کرام کا تجزیہ کر کے ان کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے، اس میں عملی اور تقابلی تنقید کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔

کتاب کے تمہیدی حصے میں شاعری کی تعریف، اس کی اہمیت اور اس کے مستقبل پر بھرپور گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ شاعری ہماری زندگی کی تکمیل اور زرخیزی کا سرچشمہ ہے۔ شاعری میں ہمیں اتفاق، ہم آہنگی اور سکون ملتا ہے۔ شاعری کو دوسرے فنون لطیفہ پر فوقیت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''کائنات کی لامتناہی گنجائش اور انسان کے سارے دماغی، دلی اور روحانی و جسمانی کوائف شاعری کے پیمانے میں سما سکتے ہیں''۔

شاعری کی تکنیک میں کلیم الدین احمد کے نزدیک تین اجزا پائے جاتے ہیں: نقوش، الفاظ اور وزن۔ شاعری میں یہ تینوں اجزا مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ شاعری کی تعریف کے بعد وہ شاعر کی جانب رخ کرتے ہیں۔ شیلیؔ نے شاعر کو بلبل سے تشبیہ دی ہے، جو اندھیرے میں گاتا ہے اور اپنی میٹھی آواز سے اپنی تنہائی کو خوش کرتا ہے، جسے سننے والے سنتے ہیں اور بے خود ہو جاتے ہیں۔ کلیم الدین احمد شیلیؔ کی اس تعریف سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاعر بلبل نہیں ہوتا، وہ صاحب دماغ

ہوتا ہے۔ وہ بلبل کی طرح عالم بے اختیاری میں نہیں گاتا۔اس کی باتوں میں تازگی اور ندرت ہوتی ہےاور وہ اپنے دور میں بلند ترین مقام پر ہوتا ہے۔

نظم کی بحث چھیڑتے ہوئے کلیم الدین احمد پیچیدگی کو اس کا وصف خاص بتاتے ہیں، جو شعر مفرد میں نہیں ہوتی۔ یہاں وہ سسلی پرودوم کی نظم کا ترجمہ پیش کر کے روایتی مضمون بے ثباتیٔ دنیا والی سادہ نظم کو میرؔ کے شعر مفرد کے مقابلے نہ صرف پیچیدہ قرار دیتے ہیں؛ بلکہ شعر کے مقابلے میں نظم کو شعوری طور پر ترجیح دے کر اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہیں۔ بے ثباتیٔ دنیا پر میرؔ کا مشہور شعر ہے:

کہا میں نے، کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اس کے مقابلے میں کلیم الدین احمد نے سسلی پرودوم کی جو نظم پیش کی ہے، وہ یوں ہے:

"اس آسماں کے نیچے سب پھول فنا ہوجاتے ہیں
اور چڑیوں کے گانے جلد ختم ہوجاتے ہیں
میں ایسی بہار کا خواب دیکھتا ہوں جو باقی رہے، ہمیشہ باقی رہے
اس آسماں کے نیچے، ہونٹ مرجھا جاتے ہیں
اور ان کے مخمل سے کچھ بھی بچ نہیں پاتا
میں ایسے بوسہ کا خواب دیکھتا ہوں جو باقی رہے، ہمیشہ باقی رہے
اس آسماں کے نیچے ہم سب اپنی دوستی
یا اپنی محبت کا رونا روتے ہیں
میں ایسی محبت کا خواب دیکھتا ہوں جو باقی رہے، ہمیشہ باقی رہے"

کلیم الدین احمد اس نظم کا موازنہ میرؔ کے مذکورہ بالا شعر سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بظاہر موضوع تو وہی ہے، جو اردو شاعری کی پرانی جاگیر ہے؛ یعنی بے ثباتیٔ دنیا؛ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نظم اور میرؔ کے شعر میں جہاں تک پیچیدگی کا سوال ہے، آسمان زمین کا فرق ہے"۔ (ص:۱۶)

کلیم الدین احمد سسلی پرودوم کی نظم کو شعر پر فوقیت محض اس لیے دیتے ہیں کہ اس کے مختلف اجزا میں ربط و تسلسل ہے؛ مگر اصل موضوع یعنی زندگی کی بے ثباتی کی حقیقت کا اظہار جس قرینے اور

سلیقے سے میرؔ کے شعر میں ہوا ہے، وہ نظم میں مفقود ہے؛ بلکہ یہ غزل کے شعر کا کمال ہے کہ جسے پرودوم نے تین بندوں کی نظم میں پیش کیا ہے، اسے میرؔ نے ایک شعر میں بہتر طور پر مکمل کر دیا ہے۔

کلیم الدین احمد کے مطابق تجربات اور ان کی شاعرانہ ترجمانی میں روح و جسم کا تعلق ہے، جسم و لباس کا نہیں۔ ہر تجربہ الگ ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اسلوب بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ پورا باب اردو شاعری کے متعلق کلیم الدین احمد کے خیالات کا نچوڑ ہے اور بعد کی ساری بحثیں اسی اجمال کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔

دوسرے باب میں غزل اور قطعہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔غزل کے تعلق سے جو خیالات وہ "گل نغمہ" میں پیش کر چکے تھے، اس باب میں انہیں خیالات کی وضاحت ملتی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ غزل میں باطنی مطابقت نہیں ہوتی۔اشعار میں شعوری، یا غیر شعوری کوئی بھی ربط نہیں ہوتا؛ بلکہ تجربوں کا انتشار ہوتا ہے۔خیالات میں بے ربطی ہی نہیں، تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ایک شعر سے دوسرے شعر تک پہنچنے میں دماغ کو رکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔اپنے ان اعتراضات کی حمایت میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ مجھ سے پہلے حالی، نظم طباطبائی اور عظمت اللہ خاں بھی ایسے ہی خیالات پیش کر چکے ہیں۔ وہ ان کے اقوال پیش کرتے ہوئے غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کی کمی کا شکوہ کرتے ہیں اور ان کا فقدان غزل کو ان کے نزدیک نیم وحشی صنف بنا دیتا ہے۔

غزل پر اپنی مشہور زمانہ تنقید کے بعد وہ قطعہ کی طرف رخ کرتے ہیں اور اسے غزل کے مقابلے میں قابل تعریف پاتے ہیں۔قطعہ میں چوں کہ بے ربطی اور پراگندگی کا نام و نشان نہیں، ہر شعر دوسرے سے بے نیاز نہیں؛ بلکہ معنی کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کا محتاج ہے اور پراگندگی و انتشار کے بجائے تعمیری یکسانیت ہے؛ اس لیے انہیں غزل کے مقابلے میں قطعہ کامیاب اور کارآمد صنف نظر آتا ہے، حالانکہ آگے چل کر وہ قطعہ میں بھی خامیاں تلاش کر لیتے ہیں۔ مثلاً قطعہ مختصر ہوتا ہے۔ وہ غزل کے درمیان میں ہوتا ہے۔ مطلع و مقطع کی کمی سے عدم تکمیلیت کا احساس ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس باب کے اختتام پر وہ مسلسل غزل اور قطعے میں نظم کی گنجائش کی طرف توجہ نہ کرنے پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔

اس کے بعد کلیم الدین احمد میر، درد اور سودا کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں؛ مگر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اظہار افسوس بھی کرتے ہیں کہ انہوں نے اعلیٰ پائے کی

شاعری کرنے کے باوجود اپنی صلاحیتوں کا مکمل استعمال نہیں کیا؛ یعنی اپنے امکانات سے پورا کام نہ لے سکے۔ وہ کہتے ہیں دراصل اردو طبقے کے ادبی مزاج کی تربیت میں غزل کا جو حصہ تھا، اس نے ان بزرگ شعرا کی صلاحیتوں کو سلب کرلیا۔ ان کی غزلوں میں جواہرات نہیں جواہرات کے ٹکڑے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل جواہرات کتنے بیش بہا ہوں گے۔

میر پر اپنی تنقید میں کلیم الدین احمد نے میر کو گرچہ غزل گو شعرا میں اہم مقام دیا ہے؛ مگر بحیثیت شاعر ان میں کچھ خامیاں بھی گنوائی ہیں۔ مثلاً میر کی قوت حاسہ محدود تھی، ان کے خیالات سطحی اور معمولی ہیں، ان کا عشق یک رخا اور ہمیشہ یاس انگیز ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ گو ان خامیوں کے باوجود کلیم الدین احمد نے میر کی شاعری کو دلکش اور متاثر کن قرار دیا ہے۔ وہ میر کی شاعری میں اس اثر آفرینی کا اقرار کرتے ہیں، جو میر کی شاعری میں نیاپن اور ''میریت'' پیدا کرتی ہے۔

درد کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کلیم الدین احمد ان کا موازنہ میر سے کرتے ہیں۔ میر اور درد دونوں عشق کرتے ہیں؛ مگر میر کا عشق مجازی ہے اور درد کا عشق حقیقی ہے۔ عشق حقیقی کی ترجمانی کی وجہ سے درد کو بعض ناقدین نے میر پر فوقیت دی ہے؛ مگر کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ عشق حقیقی ہو، یا مجازی شاعری کی دنیا میں یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے شاعر نے شدت سے محسوس کیا ہو اور اس کا اظہار فنکارانہ طور پر ہوا ہو۔ کلیم الدین احمد کو دونوں کے تجربات میں اختلاف کے باوجود ایک قسم کی یکسانیت نظر آتی ہے کہ دونوں ہی ایک مکمل تجربہ کا نقش نہیں کھینچتے؛ مگر درد کی اس بنا پر تعریف کرتے ہیں کہ انہیں کلام مربوط کی لذت اور شگفتگی کا احساس ہے اور وہ مربوط غزلیں لکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ درد کی شاعری میں زبان کی صفائی، شستگی اور پاکیزہ خیالی کی بھی تعریف کرتے ہیں؛ مگر تاثیر کے تعلق سے میر کو درد پر فوقیت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں: ''میر درد و تاثیر میں درد سے دو قدم آگے ہی رہتے ہیں''۔

میر اور درد کی شاعری پر گفتگو کے بعد کلیم الدین احمد نے سودا کی شاعرانہ انفرادیت کو موضوع بنایا ہے۔ وہ سودا کو میر و درد سے مختلف شاعر قرار دیتے ہیں کہ وہ ان کی طرح احساسات وجذبات اور درد وسوز تو نہیں رکھتے؛ مگر ان کے تجربات میں بوقلمونی ہے۔ وہ دنیا کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کرتے تھے، ان کی دنیا میر و درد کی طرح محدود نہیں تھی؛ اس لیے ان کی شاعری میں موضوعات وتجربات کا تنوع بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سودا کے اسلوب پر نظر ڈالتے ہوئے کلیم

الدین نے اس کے زور بیان اور قادرالکلامی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ہنگامہ خیزی، یہ طنطنہ دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔

میر، درد اور سودا کے بعد کلیم الدین احمد ذوق، غالب اور مومن کی غزل گوئی کو موضوع بناتے ہیں۔ ان تینوں شعرا سے بھی انہیں یہی شکایت ہے کہ انہوں نے غزل کو زیادہ اہمیت دی اور اس کی ماہیت میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہیں کی۔ ذوق کو سودا کی قادرالکلامی کا وارث بتاتے ہوئے انہوں نے ذوق کے یہاں طبعی و اخلاقی خشکی اور تاثیر کے فقدان کا شکوہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سودا کا میدان ذوق کے مقابلے میں وسیع ہے۔ ذوق اخلاقی مضامین کو صفائی اور شستگی سے پیش کرتے ہیں؛ مگر ان کے یہاں جذبات کی گرمی، احساسات کی تازگی اور تخیل کی رنگ آفرینی نہیں کے برابر ہے۔

غالب کی شاعری میں کلیم الدین احمد کو سودا کے دماغ اور تخیل سے ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے؛ مگر وہ غالب کے فلسفیانہ مضامین اور بلند ذہن ودماغ کا اعتراف کرتے ہیں، غالب کی نئی تشبیہات، نئے استعارات، جذبات وخیالات کی اصلیت، مشاہدے کی گہرائی اور جوش وتاثیر کے بھی معترف ہیں؛ مگر اس کے اسلوب کو ناہموار اور فارسیت سے مغلوب بتاتے ہیں، اس کے بعد ایک غزل کی عملی تنقید کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ غالب کے کلام میں کم از کم تین طرح کے اسالیب پائے جاتے ہیں۔ پہلے اسلوب میں فارسیت کا غلبہ ہے، دوسرے میں سادگی ہے اور تیسرا اسلوب ان دونوں اسالیب کے درمیان کا ہے، جس میں فارسی الفاظ اور بندشوں کی سیدھی سادی اور خوشگوار آمیزش ملتی ہے۔ اسے وہ اسلوب کی ناہمواری قرار دیتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں اسالیب غالب کے متنوع طرز اظہار پر دسترس کا ثبوت ہیں اور تین طرح کی فنی تکمیل کا احساس دلاتے ہیں؛ اسی لیے آخر میں وہ غالب کی انفرادیت قبول کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ:

''ان سب خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی غالب مخصوص آرٹ کے مالک ہیں''۔ (ص: ۱۴۸)

مومن پر گفتگو کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے ان کی بلند خیالی اور معنی آفرینی کی تعریف کی ہے؛ مگر ساتھ ہی ان کے شعروں میں تاثیر کی کمی کی شکایت بھی کی ہے۔ کلیم الدین احمد شاعری کو محض جذبات کے اظہار کا آلہ نہیں سمجھتے اور مشرق ومغرب میں اس عام غلط فہمی کے رائج ہونے پر افسوس بھی ظاہر کرتے ہیں؛ مگر غالب اور مومن کے اشعار میں جذبات کی فراوانی اور معنی آفرینی کو ہی ان کی شاعری کا اختصاص قرار دیتے ہیں:

"غالب اور غالب سے زیادہ مومن کے شعر صرف ہمارے جذبات ہی کو نہیں بھڑکاتے؛ بلکہ ہمیں غور وفکر کی بھی دعوت دیتے ہیں"۔ (ص:۱۹۹)

معنی آفرینی اور دعوت فکر کے علاوہ نئی بندشیں، نئی ترکیبیں اور واقعیت مومن کی شاعری کا حسن بڑھاتی ہیں اور رکاکت و بازاری پن سے اجتناب ملتا ہے؛ اس لیے کلیم الدین احمد، مومن کو صاحب طرز شاعر مانتے ہیں۔

غزل اور غزل گوشعرا پر تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد کلیم الدین احمد دیگر اصناف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ان کی نگاہ قصیدے پر پڑتی ہے۔ وہ صنف قصیدہ کے تعلق سے پہلے عمومی گفتگو کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرتے ہیں؛ مگر ان امور پر زیادہ نظر ڈالتے ہیں، جن کی وجہ سے اردو میں یہ صنف مقبول نہیں ہوسکی۔ انہوں نے فارسی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ فارسی اثر نے اردو قصیدوں کی مٹی پلید کردی۔ اس کی وجہ سے نزاکت خیال، معنی آفرینی، شوکت الفاظ پر توجہ دی گئی اور یہ چیزیں قصیدے کے اجزا میں شمار ہونے لگیں۔ رفعت خیال کے بے جا غلبے کی وجہ سے غیر معمولی اور نامانوس قافیے کا انتخاب ردیف کی دشواری، قصیدے میں پراگندگی اور بے ربطی کا سبب بن گئی۔ اجزائے قصیدہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ تشبیب میں گنجائش تلاش کرلیتے ہیں؛ مگر اردو شعرا کی ان گنجائشوں سے فائدہ نہ اٹھانے پر مایوس بھی ہوتے ہیں۔ ہاں غالب کے قصیدے:

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

کی تشبیب کی سلاست، روانی اور متانت کی تعریف کرتے ہیں اور اس میں آہنگ کی یکسانی بھی نہیں پاتے۔

قصیدہ گو شاعروں میں کلیم الدین احمد نے سوداؔ کو بہترین قصیدہ گو شاعر کہا ہے؛ لیکن بے جا طوالت اور جذبات نگاری میں مبالغہ کو سوداؔ کا عیب بھی بتایا ہے۔ اپنی بات کی تائید میں انہوں نے سوداؔ کے مشہور قصیدے کے چند اشعار نقل کئے ہیں:

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

مگر مجموعی طور پر سوداؔ کے قصیدوں میں شان وشوکت، خیالات کی بلندی، بندشوں کی ندرت اور نزاکت خیال کی تعریف کرتے ہیں۔

ہجو کے باب میں وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے مدحیہ قصیدے سے کسی طرح کم نہیں سمجھتے؛ بلکہ ہجو یہ نظم میں بلند پایہ شاعری کو ممکن قرار دیتے ہیں؛ مگر یہ شرط لگادیتے ہیں کہ وہی شاعر اعلیٰ پائے کا ہجوگو ہوسکتا ہے، جس کا معیار اخلاق وقیع ہو اور جس کا دل شریف جذبات سے معمور ہو، جو انسانی فعل کو عقل وصداقت کی میزان پر تول سکے اور جو بے خوف ہوکر ظلم وبدی کے خلاف آواز اٹھانے پر کمربستہ ہوسکے۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

"وہی شاعر اعلیٰ پائے کا ہجوگو ہوسکتا ہے، جس کا معیار اخلاق رفیع ہو، جو ہر انسانی فعل کو عقل وصداقت کی میزان پر تولے، جس کا دل شریف جذبات سے معمور ہو، جو ظلم، بے رحمی، بدی، حماقت کے نظارے سے متاثر ہوکر ان کے رفع کرنے پر کمربستہ ہو، جس میں حقارت، غضب، نفرت کے جذبات موجود ہوں، جو طنز وظرافت کا مالک ہو، جس کا دل بے خوف وہراس ہو، جسے نہ کسی انعام کا لالچ ہو، نہ کسی انتقام کا ڈر ہو اور جو بلند پایہ صناع ہو"۔ (ص:۳۰۱)

ذوق اور سودا میں وہ سوداؔ کو بہتر قصیدہ گو مانتے ہیں؛ کیوں کہ مذکورہ خوبیوں میں سے بیشتر سوداؔ کے یہاں موجود ہیں، نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سوداؔ کے یہاں جذبات وخیالات کا سیلاب ذوق سے کہیں زیادہ ہے، جبکہ سوداؔ کے مقابلے ذوق کے یہاں نثریت، آورد اور تصنع زیادہ پایا جاتا ہے۔

مثنوی کے باب میں کلیم الدین احمد نے اس صنف کے تعلق سے تفصیلی اور مدلل گفتگو کی ہے۔ وہ قصیدے کے مقابلے میں مثنوی میں وسعت اور تنوع زیادہ پاتے ہیں؛ مگر شکوہ سنج بھی ہیں کہ اردو شعرا اس میں اپنی وسعت کا ثبوت پیش نہ کرسکے اور نہ ہی شاہنامہ فردوسی، یا مثنوی مولانا روم جیسی کوئی مثنوی اردو میں تخلیق کرسکے۔ انہوں نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ اردو مثنویوں میں چند محدود قصے ملتے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر عشقیہ قصے ہیں۔ اردو شعرا میں اتنی قوت تخیل نہیں کہ وہ نئے افسانے ایجاد کرسکیں۔ کردار مافوق الفطری، ہیرو اتنا حسین کہ ہیرو وہیروئن میں کوئی فرق باقی نہ رہے، اصلیت نام کو نہیں، تجربے نامانوس۔ فنی طور پر بھی منظر نگاری، زبان وبیان وغیرہ کا جائزہ لینے کے بعد بے اطمینانی کا ہی اظہار کیا گیا ہے۔ ہاں میرؔ کی مثنوی "خواب وخیال" اور سوداؔ کی مثنویوں کو

پسند کرتے ہیں؛ کیوں کہ یہ مروجہ روش سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں اور اس قسم کی نظموں کی جانب توجہ نہ کرنے پر مایوسی بھی ظاہر کرتے ہیں۔

میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' میں وہ مثنوی کی تمام خوبیاں اور خامیاں پاتے ہیں۔ حالؔی نے لکھا ہے کہ میر حسن نے قصے کے تمام فرائض ادا کر دیئے ہیں؛ مگر کلیم الدین احمد اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ انہیں اس میں کئی خامیاں نظر آ جاتی ہیں۔ مثلاً قصہ نہایت پتلا ہے، افراد اجنبی دنیا کے معلوم ہوتے ہیں، کردار نگاری میں انفرادیت، منظر نگاری میں اصلیت نہیں، جہاں داخلی کیفیات کا اظہار ہے، وہاں صفائی تو ضرور ہے؛ مگر شعریت نہیں ملتی۔ میر حسن ایک تماشائی کی حیثیت سے خارجی اشیا کی طرح ہی داخلی احساسات کا بھی نقش مرتب کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، البتہ کلیم الدین احمد ''سحر البیان'' کے طرز ادا کے قائل نظر آتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہوئے عبارت کی پاکیزگی وصفائی، بیان میں شوخی، دل پذیری، شیرینی اور ترنم اور الفاظ کی نرمی جیسے اوصاف کا اعتراف کرتے ہیں؛ بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ:

''طرز ادا ہی اس مثنوی کی زندگی کا سبب ہے، ورنہ اس کے دوسرے اجزا میں کوئی خاص بات نہیں''۔ (ص:۳۲۰)

اس کے برعکس مثنوی ''گلزار نسیم'' کے بارے میں کلیم الدین احمد اچھی رائے نہیں رکھتے۔ وہ دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میر حسن کی زبان تازہ، شگفتہ اور معطر گلاب ہے۔ نسیم کی زبان گلاب کا جوہر ہے؛ اس لیے عطریت تو بڑھ گئی ہے؛ لیکن آنکھوں کو گلاب کی شگفتگی نہیں ملتی''۔ (ص:۳۲۱)

مگر اس کی اہمیت کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ:

''یہ مثنوی عجوبۂ روزگار ہے اور اپنی ندرت کی وجہ سے لائق تعریف ہے''۔ (ص:۳۴۵)

اس کی ندرت یہ ہے کہ یہ پوری مثنوی پر تصنع زبان واسلوب میں لکھی گئی ہے اور نسیم نے چونکہ پوری مثنوی اسی اسلوب میں لکھی ہے؛ اس لیے تصنع باقی نہیں رہتا، اسے سمجھ کر طبیعت مسرور ہوتی ہے۔

شوق کی مثنویاں حسنِ بیان کی وجہ سے اردو میں پسند کی جاتی رہی ہیں؛ مگر حالی اور دیگر لوگوں نے مخرب اخلاق اور عریاں ہونے کے سبب ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے عریانی کے ایک خاص اور بلند مقصد کے تحت استعمال کو جائز قرار دیا ہے اور مثال میں ڈی ایچ

لارنس کے ناول Lovers & Sons کو پیش کیا ہے، جس میں عریانی ہوس پرستی نہیں؛ لیکن شوق کی عریاں تصویر کشی کو انہوں نے ڈی ایچ لارنس پر فوقیت نہیں دی ہے۔ کلیم الدین احمد نے شوق کا اصل کمال یہ بتایا ہے کہ شوق نے مثنوی کو زندگی سے قریب کیا ہے۔ وہ بھی حالی کی طرح شوق کی زبان اور محاوروں کی تعریف کرتے ہیں اور شوق کی مثنویوں کو ان کی زندگی کا ضامن قرار دیتے ہیں۔

مرثیہ پر گفتگو کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے اسے اہم صنف تو مانا ہے؛ مگر ایک چونکانے والی بات بھی کہہ دی ہے کہ ''مرثیہ میں وسعت بھی ہے اور تنگی بھی''۔ وسعت اس لیے کہ اس میں رزمیہ شاعری کے امکانات ہیں اور تنگی اس لیے کہ مرثیہ ماتم اور آہ وبکا تک محدود ہو کر رہ گیا۔ گویا یہ نہ Epic بن سکا اور نہ Elegy۔ نہ مرثیہ گو اسے شاعری سمجھتا ہے اور نہ سامعین اسے شعری معیار پر پرکھتے ہیں۔ مذہب سے تعلق ہونے کی بنا پر اس کے واقعات غیر جانبدارانہ نہیں ہوتے اور جانبداری شعریت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد کا ایک تعمیری مشورہ ہے کہ واقعہ کربلا کو ایک مسلسل نظم کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ مرثیے ہنوز مختلف واقعات کے ٹکڑے محض ہیں۔

کلیم الدین احمد کا سب سے بڑا اعتراض مرثیہ گو کی جانبداری اور مرثیہ کے کرداروں کے یک رخے پن پر ہے۔ وہ بین کو بھی مرثیے کے ہلکے پن کی وجہ مانتے ہیں؛ مگر مرثیے میں جذبات واحساسات کی جو وسعت ہے وہ ان خامیوں کا بدل بن جاتی ہے۔ بقول کلیم الدین احمد:

''اردو شاعری کی دوسری صنفوں کے مقابلے میں جہاں تنگی سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے، یہ وسعت قابل تعریف ہے''۔ (ص:۴۰۳)

اسی وجہ سے وہ انیس کے مرثیوں کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ انیسؔ نہایت عمدہ اور لطیف طریقے سے حسیات کی تصویر کشی کرتے ہیں، نیز جنگ اور نزاع کا بیان نہایت جوش وصفائی سے کرتے ہیں، جبکہ دبیرؔ کے یہاں ان امور میں آورد زیادہ ہے۔ ان کی زبان میں شان وشوکت اور زور وپختگی غیر فطری قسم کی ہے۔

ان اصناف کے علاوہ مسدس، مخمس، مربع، مثلث، ترجیع بند وغیرہ کی حیثیت کلیم الدین احمد کے نزدیک محض شاعرانہ مشق کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان صنفوں کو شعرا نے زیادہ اہمیت نہ دی''۔ (ص:۴۰۵)

اس جلد کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر نظیرا کبر آبادی کی شاعری کا جائزہ شامل ہے۔نظیرا کبر آبادی کلیم الدین احمد کی نگاہ میں آسمان شاعری پر تنہا درخشاں ستارہ کی طرح ہیں۔کلیم الدین احمد کی یہ رائے مبالغہ آمیز ہوسکتی ہے؛مگران کا مخصوص نقطۂ نظر ایک لحاظ سے مبنی برحقیقت بھی ہے۔نظیر نہ صرف نظم گو شاعر ہیں؛ بلکہ غزل میں بھی انہوں نے نئی راہیں نکالیں؛یعنی ان میں تسلسل اور ربط کی وجہ سے نظم کی سی ہی کیفیت پیدا کی۔کلیم الدین احمد ان کی غزلوں کے لیے ''نظمی غزل'' جیسی اصطلاح بھی وضع کرتے ہیں۔نظیر کی کچھ غزلوں اور نظموں کا تفصیلی تجزیہ کرنے کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> ''غزل کے میدان میں نظیر کی حیثیت مجتہد کی ہے،انہوں نے غزل میں نئے نئے تجربات کئے،اس کے امکانات کا جائزہ لیا۔مضامین اور صورت دونوں میں آزادی اور جدت سے کام لیا۔غزل کی پراگندگی اور انتشار کو دور کرنے کے لیے مختلف صورتیں ایجاد کیں اور یہ بات واضح کردی کہ غزل کی صورت برقرار رکھتے ہوئے بھی اس میں نظم لکھی جاسکتی ہے،یہ نظیر کا خاص کارنامہ ہے''۔(ص:۱۶)

جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ یہ پوری کتاب ''گل نغمہ'' کے ایک جملے ''غزل نیم وحشی صنف سخن ہے'' کی تفصیل ہے؛اس لیے کتاب کے ہر باب میں وہ شاعری میں ربط وتسلسل اور مکمل بیان کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں اور غزل کی پراگندگی سے شکوہ کناں نظر آتے ہیں،یہاں تک کہ اردو کی دوسری اصناف شاعری کو برباد کرنے کا ذمہ دار بھی وہ غزل کے اسی مزاج کو سمجھتے ہیں،چنانچہ ہر باب کا اختتام کسی نہ کسی شکل میں وہ اسی نظریے کے اظہار پر کرتے ہیں۔مثلاً قطعہ کو غزل سے الگ کرنے کا مشورہ دینا،میؔر سے غزل کے بجائے نظموں کا مطالبہ کرنا،درد کی غزل کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہنا کہ ''پھر بھی اس میں وہ خوبی نہیں جو اچھی نظم میں ہوتی ہے''،سودا کو شعر مفرد میں کمی کا احساس دلانا،غالب کا تنگنائے غزل سے واقف ہونے کے باوجود آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا،نظیر کی طرح مسدس،مخمس جیسی نظمیں نہ لکھنے کا شکوہ کرنا،مومن کے شعروں میں ربط وتسلسل کی کمی دکھانا وغیرہ ایسے نکات ہیں،جن سے کلیم الدین احمد کا مخصوص نقطۂ نظر پوری کتاب پر حاوی نظر آتا ہے۔

۲۔اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم)

'اردو شاعری پر ایک نظر' کا دوسرا حصہ ۱۲/ابواب پر مشتمل ہے،جس میں کلیم الدین احمد نے آزاد،حالی،شبلی،اسمٰعیل،شوق،اکبر،اقبال اور ترقی پسند شعرا سے ہوتے ہوئے فراق گورکھپوری تک

اردو شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔بحث کا آغاز وہ نئی شاعری سے کرتے ہیں اور نئی شاعری کا بانی انجمن پنجاب کے حوالے سے محمد حسین آزاد کو قرار دیا ہے۔وہ اردو شاعری کی خامیوں کو فارسی کے اثرات کا نتیجہ سمجھتے ہیں؛اس لیے آزاد کے انگریزی ادب سے استفادے کو وہ بنظر تحسین دیکھتے ہیں۔حالی کی طویل نظموں کے سلسلے میں ایک قسم کی معذرت کو ان کی لاعلمیت پر محمول کرتے ہوئے انہیں مغربی ادب سے ناواقف ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور ان کی شاہکار نظم ''مسدس حالی'' کو ایسا ریگستان قرار دیتے ہیں،جس میں کبھی کبھی کوئی مختصر سی سرسبز وشاداب جگہ ملتی ہے۔

کلیم الدین احمد کی نظر میں شبلی نے اسلامیت کو داخل شعر کیا۔وہ شبلی کے صرف ایک مرثیے کی تعریف کرتے ہیں،جو انہوں نے اپنے بھائی کی وفات پر لکھا تھا؛لیکن اس میں بھی شعریت کی کمی کا نقص نکال ہی ڈالتے ہیں۔کلیم الدین احمد کی نظر میں آزاد،حالی اور شبلی اخلاقی مضامین کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں شعریت کم نثریت زیادہ ہے؛اس لیے انہیں مجدد شاعر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ہاں یہ ضرور تسلیم کیا ہے کہ ان تینوں نے اپنے مابعد شعرا کی رہنمائی کا فریضہ بخوبی انجام دیا ہے۔

حالی وشبلی سے متاثر شاعر اسماعیل میرٹھی کی دیہی شاعری کو کلیم الدین احمد پسند کرتے ہیں اور ان کے کلام کی سادگی،دل فریبی،تازگی اور ترنم کی تعریف بھی کرتے ہیں۔بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی نظموں کو وہ قابل اعتنا نہیں سمجھتے،جب کہ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے شاعر کی حیثیت سے ہی اپنی شناخت قائم کی۔

کلیم الدین احمد نے اکبرالہ آبادی کی شاعری کو سماجی تاریخ کی حیثیت دی ہے اور ان کی نکتہ سنجی اور تخیل کی تیز پروازی کو سراہا ہے؛مگر یہ مشورہ دینے سے بھی نہیں چوکے کہ اگر اکبر نظم کے مسلسل اور پیچیدہ نظام کو سمجھتے اور اسے برتتے تو وہ بہت کچھ کر سکتے تھے،یا ''اکبر مفصل نظمیں لکھتے تو ان کی شاعری کی اہمیت زیادہ ہوجاتی''۔

شوق کی نظموں اور غزلوں پر بھی انہوں نے نگاہ ڈالی ہے۔کہیں کہیں تعریف بھی کی ہے؛لیکن ان کی طوالت کو وہ گرفت میں لیتے ہیں۔یہ عجیب بات ہے کہ کلیم الدین احمد شوق کی نظموں کی طوالت کو عیب قرار دیتے ہیں اور اکبرالہ آبادی سے مفصل اور طویل نظموں کا تقاضا کرتے ہیں۔شوق کی مختصر نظموں کو بھی انہوں نے اخلاقی مضامین سے گرانبار بتایا ہے؛مگر ''عالم خیال'' اور ''نیرنگ خیال'' کو ان کی شاعری کا اہم ترین کارنامہ تسلیم کرتے ہوئے انہیں اردو میں اجتہاد قرار دیا ہے۔

اقبال کی شاعری پر کلیم الدین احمد کی تنقید کافی متنازعہ رہی ہے۔ وہ اقبال کو بہترین قومی اور ملی شاعر تو بتاتے ہیں؛ مگر اس قسم کی شاعری کو بلند مرتبت شاعری نہیں سمجھتے۔ اقبال کی شاعری کا ایک رنگ منظری شاعری کا بھی ہے۔ مثلاً ''ہمالہ'' اور ''گل رنگیں''۔ کلیم الدین احمد کو اس قسم کی شاعری میں آورد ہی آورد نظر آتی ہے۔ اقبال کی ''طنزیہ'' شاعری میں بھی وہ کوئی خاص بات نہیں پاتے۔ ہاں اقبال کی 'لیرک شاعری' کی وہ تعریف کرتے ہیں اور اس قسم کی شاعری سے دست بردار ہونے پر اظہار افسوس بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ''ایک آرزو'' کو وہ اہم نظم تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ میں نے اوپر کہا کہ کلیم الدین نے اقبال کی قومی وملی شاعری کو ہی اہم مانا ہے اور اقبال کی وسعت نظر، ذہنی بلندی اور گہرے خیالات کا اعتراف کرتے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں ان کی اہمیت کا اقرار بھی کیا ہے۔ قومی وملی شاعری میں وہ ''شکوہ''، ''خضر راہ''، ''ساقی نامہ''، ''شعاع امید'' اور ''طلوع اسلام'' کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اشعار میں ربط، حسن اور شعریت کی تعریف کرتے ہیں؛ مگر آخر میں پیغام کی زیادتی اور شعریت کی کمی کا شکوہ بھی کر ڈالتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پیغام محض شعر نہیں ہوسکتا۔ قومی اور ملی شاعری سریع التاثیر ہوتی ہے اور اس کی دنیا تنگ ہوتی ہے۔

''خضر راہ'' کے جن اشعار میں کلیم الدین احمد کو پیغام نظر آتا ہے اور جس کی وجہ سے شعریت مجروح ہوتی ہے، ان میں یہ اشعار بطور خاص نقل کئے گئے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِن الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردان ساز دلبری
خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم ساحری

بقول کلیم الدین احمد ''ان شعروں میں نثریت غالب ہے، ہر شعر میں ایک سیدھا اور عریاں خیال ہے، جس کا بیان نثر میں بھی ممکن تھا''۔ (ص:۱۵۳)

کلیم الدین احمد نے ''بال جبریل'' کی غزلوں کی تعریف کی ہے؛ کیوں کہ یہ روایتی غزلیں نہ تھیں۔ ان غزلوں میں خیال کی مرکزیت کلیم الدین احمد کو اس کا وصف نظر آتی ہے۔ بہر حال غزل کی فضا بدلنے میں اقبال کے رول کو وہ اہم گردانتے ہیں اور اسی لیے اقبال کو وہ ایسا شاعر بتاتے ہیں، جس کی اردو شاعری منتظر تھی۔

سیماب، چکبست، حفیظ، افسر اور اختر شیرانی کی شاعری کا جائزہ کلیم الدین احمد نے اقبال کی صدائے بازگشت کے طور پر لیا ہے۔ یہ تمام شعرا نہ صرف اقبال کے ہم عصر تھے؛ بلکہ کسی نہ کسی طرح ان سے متاثر بھی تھے؛ اس لیے منظری، قومی اور ملی شاعری ان کے یہاں بھی ملتی ہے۔ کلیم الدین احمد ان کا اعتراف اس لیے کرتے ہیں کہ انھوں نے نظم کی طرف توجہ کی اور نظم کی مختلف ہیئتوں کو اردو میں فروغ دیا۔

سیمابؔ نے مناظر فطرت اور قومی شاعری کو اپنایا۔ کلیم الدین احمد، سیمابؔ کی منظر نگاری کی تعریف کرتے ہیں؛ مگر یکسانیت، آورد اور تصنع کی زیادتی کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ چکبستؔ کی نظموں پر وہ اقبال کا رنگ تلاش کرتے ہیں؛ مگر انھیں جذبات برانگیختہ کرنے والی اور موضوعاتی اعتبار سے یکساں معیار کی قرار دیا ہے۔ حفیظ جالندھری کے ''شاہنامہ اسلام'' کو قوت اختراع اور جدت طرازی کی مثال قرار دیتے ہیں؛ مگر اس کی زبان کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے نثر زدہ اسلوب کا حامل سمجھتے ہیں۔ افسر کا ذکر وہ محض ان کی ایک نظم ''وطن کا راگ'' کی وجہ سے کرتے ہیں؛ مگر اسے بھی اقبال کی نظم ''ترانۂ ہندی'' کی صدائے بازگشت قرار دیتے ہیں۔ اختر شیرانی کی شیرینی، ترنم، بندش الفاظ اور زور بیان کا ذکر کرتے ہوئے کلیم الدین احمد ان کی فطرت شناسی کی قدر کرتے ہیں؛ مگر نظموں کی طوالت کو ان کا عیب قرار دیتے ہیں اور کامیاب مکمل نظم نہیں تسلیم کرتے ہیں۔

جوش کی اس خوبی کا اعتراف کرنے کے باوجود کہ ''جوش کی شاعری عصر حاضر کی فضا میں سانس لیتی ہے''، کلیم الدین احمد جوش کی انقلابی شاعری اور ان کی فنکاری سے انکار کرتے ہیں۔ وہ جوش کی شاعری کو خطابت، تک بندی، لفظی گورکھ دھندا سے تعبیر کرتے ہیں۔

جوش کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ترقی پسند شعرا کی خوب خبر لی تھی۔ اب ترقی پسند شاعری کو موضوع گفتگو بناتے ہوئے وہ اس کے تمام شعرا سے عدم پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ انھیں شکوہ ہے کہ یہ شعرا اپنے مسلک کی تبلیغ کو ہی شاعری سمجھتے ہیں۔ وہ ترقی پسند شعرا کی فکری اور فنی دونوں قسم کی

یکسانیت پر تنقید کرتے ہیں اور ان سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ علی سردار جعفری کی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کو پروپیگنڈہ قسم کی شاعری کہتے ہیں؛ مگر ''پتھر کی دیوار'' اور ''میرے خواب'' کی تعریف کی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ غیر ضروری مصرعے اور باتیں نکال دی جائیں۔ وہ جعفری کی خطابت، جوش اور تفصیل نویسی کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

فیض، کلیم الدین احمد کی نگاہ میں دیگر ترقی پسند شعرا سے ممتاز ہیں۔ اولاً اس لیے کہ وہ شاعری میں فنی تقاضوں کا خیال رکھتے ہیں اور دوم اس لیے کہ ایک قسم کی خود ضبطی ہے، جو فیض میں ملتی ہے۔ ''تنہائی'' اور ''انتظار'' کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ ''تنہائی'' کو ترجیح دیتے ہیں؛ مگر ایک مغربی نظم سے موازنہ کرنے پر یہ بھی بہت پیچھے ہو جاتی ہے۔ ''دستِ صبا'' کی نظمیں کلیم الدین احمد کی نگاہ میں قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔

آزاد نظم کے باب میں کلیم الدین احمد نے آزاد نظم کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے؛ مگر اردو میں آزاد نظموں سے وہ مطمئن نہیں ہیں؛ کیوں کہ اکثر یہ قصداً لکھی جاتی ہیں، نہ کہ تجربے کے دباؤ کے تحت۔ وہ راشدؔ اور میراجیؔ کی نظموں کا تجزیہ کر کے بتاتے ہیں کہ مصرعوں کو توڑ پھوڑ کر آزاد نظم نہیں بنتی۔

''اردو شاعری پر ایک نظر'' کے پہلے حصے میں کلیم الدین احمد نے اپنے والد کے شعری مجموعے ''گل نغمہ'' کو اردو شاعری میں ایک نئے اور خوشگوار باب کا اضافہ قرار دیا تھا، جس پر کافی اعتراضات بھی ہوئے تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے وہ عبارت بدل ڈالی اور ساری ذمہ داری خود پر لے لی۔ زیرِ نظر حصے کے نویں باب میں وہ ''گل نغمہ'' کی تکنیک، ترکیبوں اور زبان کی لغزشوں کا اعتراف کرنے کے باوجود اس کی نظموں کو اردو کی عام نظموں پر ترجیح دیتے ہیں اور ان میں تجربوں کی سچائی، ربط وتسلسل، اسلوب کی بیساختگی اور تعمیری یکسانی کا ذکر کرتے ہوئے واقعی نظم قرار دیتے ہیں۔ وہ ''گل نغمہ'' کی کئی نظموں کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور خاص طور پر ''عالم تنہائی''، ''انتظار'' اور ''وحشت'' کا ذکر کرتے ہیں؛ مگر بڑی خوبصورتی سے ان نظموں کا موازنہ فیض کی ''تنہائی'' اور ''انتظار'' سے کرنے سے خود کو بچالے جاتے ہیں، جبکہ اس سے قبل ترقی پسند شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے وہ فیض کی ان نظموں کا بطور خاص ذکر کر چکے تھے۔

دسویں باب میں ''نئی غزل'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے غزل کی فراوانی کی وجہ اس کی آسانی کو قرار دیا گیا ہے۔ غزل کی تبدیلی کی مثال ان کے نزدیک صرف اقبال ہیں، پھر بھی وہ پانچ شعرا

حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور فراقؔ کا ذکر بطور خاص کرتے ہیں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ نئی غزل زندگی سے قریب ہوگئی ہے اور حقیقی مسائلِ زندگی غزل کا موضوع بن رہے ہیں۔

حسرت کی وہ تعریف کرتے ہیں کہ ان کی شاعری میں اصلیت وصداقت ہے اور وہ قدیم رنگ میں بھی انفرادی شان حاصل کر لیتے ہیں۔ فانیؔ کی شاعری کے دائرے کو وہ محدود مانتے ہیں اور وجہ محدود موضوعات کو قرار دیتے ہیں؛ مگر ان کی تعریف بھی کرتے ہیں کہ فانیؔ کو غمِ ہستی کا احساس ہے اور درد و یاس کے جذبے میرؔ کے بعد کسی کے یہاں ہیں تو وہ فانیؔ ہیں۔ جگرؔ کی شاعری کو کلیم الدین احمد قدیم وجدید رنگ تغزل، رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا مضحک نمونہ قرار دیتے ہیں۔ جگر کے یہاں زبان کی ساری خوبیاں مشق کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور کلیم الدین احمد کی نظر میں فریب نظر ہے۔

اصغر کے متعلق کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ وہ غالب کی زندہ دلی اور شوخی سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں فانی یاسیت کے امام ہیں تو اصغر نشاط کے بادشاہ۔ ان کی غزلیں اس کم معیاری کے زمانے میں غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی غزلوں سے ربط وتسلسل کی کمی کا شکوہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

فراق کی مغربی ادب سے واقفیت اور تنقیدی نگاہ کے کلیم الدین احمد معترف ہیں؛ اس لیے حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ انہیں غزل کی کمیوں کا احساس کیوں نہیں۔ وہ فراق کی غزلوں میں ربط وتسلسل اور درد بھرے لہجے کا اعتراف کرتے ہیں؛ مگر ان کی پرگوئی اور رومانویت سے شکایت بھی رکھتے ہیں۔

اپنے اختتامی باب میں کلیم الدین احمد نے ہمیشہ کی طرح اردو شاعری کی کم مائیگی اور کمیوں کا ذکر کیا ہے۔ اردو شاعری پر اپنی سخت تنقید کو وہ اس صنف سے ہمدردی اور واقعی شغف بتاتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اسے دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے دوش بدوش لانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اپنی خامیوں پر نگاہ ڈالی جائے تو اس کا مقصد استہزا نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنی کمیوں سے واقف نہ ہوں گے تو اسے دور کیسے کریں گے۔ ان کے مطابق ان کی تنقید پر اردو دنیا نے ٹھنڈے دماغ سے غور ہی نہیں کیا۔ یہاں ادبی بت پرستی کا جو رواج ہے، وہ اپنی خامیوں کی جانب متوجہ ہونے ہی نہیں دیتا اور اس حال میں امید کی کرن نظر نہیں آتی، لہٰذا وہ اپنا امکان پیش کرتے ہیں کہ ''اردو شاعری کا مستقبل امید افزا نظر نہیں آتا''۔ (ص:۶۲۶)

۳۔اردو تنقید پر ایک نظر

۱۹۴۲ء میں کلیم الدین احمد کی دوسری معرکۃ الآرا کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' شائع ہوئی، جس میں انہوں نے اردو تنقید، اس کی روایت اور موجودہ صورت حال کا تجزیہ اور محاسبہ کیا ہے۔ کلیم الدین احمد کو اردو تنقید سے بے حد مایوسی ہے اس لیے وہ اردو میں اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور ایک سخت جملہ کہتے ہیں کہ:

''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے، یا معشوق کی موہوم کمر''۔ (ص:۱۲)

اس جملے کا ٹھیک ویسا ہی ردعمل ہوا، جیسا غزل کے سلسلے میں ان کے مشہور جملے کا ہوا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ میری بات سے طوفان بپا ہوگا اور میرے اوپر بے دردی اور سختی کے الزامات عائد ہوں گے؛ اس لیے وہ اپنی تنقید کے لیے زمین تیار کرتے ہیں اور اپنی سخت تنقید کی مثال باغباں کی تراش وخراش سے دیتے ہیں۔ وہ اس سے قبل کے ادبی کارناموں کی تاریخی اہمیت تو تسلیم کرتے ہیں؛ مگر اس کی افادیت سے انکار کرتے ہیں اور مثال میں فورڈ کی بنائی پہلی موٹر کا ذکر کرتے ہیں، جو تاریخی اہمیت کی حامل ہے؛ مگر کارآمد نہیں۔ اس کی جگہ محض میوزیم میں ہی ہوسکتی ہے۔ اردو تنقید کی اس کم مائیگی کی اصل وجہ وہ تنقیدی اصولوں سے ناواقفیت اور اردو میں اصول تنقید کی تشریح کا فقدان بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید ایک مشکل ترین فن ہے۔ محض اپنی پسند یا ناپسندیدگی کا اظہار کر کے کوئی ادیب ناقد نہیں بن سکتا۔ وہ کہتے ہیں:

''اگر آپ کاشت کاری کے اصول سے واقف نہیں تو آپ کسان نہیں بن سکتے۔ اسی طرح اگر آپ اصول تنقید سے واقف نہیں تو آپ نقاد نہیں بن سکتے۔ اردو میں اصول تنقید کی تربیت اور تشریح ابھی تک نہیں ہوئی''۔ (ص:۱۱)

یعنی بغیر اصول وضوابط کے جو تنقید ہوگی وہ کلیم الدین احمد کی نگاہ میں کھیل، یا تفریح ہوگی، ادبی تنقید نہیں۔ تنقید کے فرائض وہی شخص انجام دے سکتا ہے، جو ان اصولوں سے واقف ہو۔ کہتے ہیں:

''تنقید کوئی کھیل نہیں ہے، جسے ہر شخص بہ آسانی کھیل سکے۔ یہ ایک فن ہے، ایک صناعی ہے، فن تو ہر طرح کے ہوتے ہیں، مشکل بھی اور آسان بھی۔ تنقید مشکل ترین فن ہے۔ ہر فن کی طرح اس کے بھی اصول وضوابط اور اغراض ومقاصد ہیں۔ ادب اور زندگی

میں اس کی مخصوص اور قیمتی جگہ بھی ہے؛ اس لیے ہر کس وناکس ایک نقاد کے فرائض انجام نہیں دے سکتا ہے''۔ (ص:۱۶)

گویا کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ ہر شخص جو اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کرتا ہے، وہ نقاد نہیں بن سکتا؛ مگر اردو میں یہی طریقہ رائج ہے؛ اسی لیے انہیں اردو ادب میں موجود انتقادی ادب کا ذخیرہ قابل اعتنا نظر نہیں آتا۔

کلیم الدین احمد تذکروں کی تنقیدی اہمیت تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی شکایت ہے کہ تذکروں میں شعرا کو حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا جاتا ہے اور بس۔ نہ عہد کا خیال ہوتا ہے، نہ انداز واسلوب کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی شعراء کے مقام ومرتبے متعین کئے جاتے ہیں، لہٰذا تذکروں کی تاریخی اہمیت تو ہوسکتی ہے، ان کی ادبی اور تنقیدی اہمیت میں شبہ ہے۔ پرانے تذکروں کے مقابلے میں وہ ''آب حیات'' کو فوقیت دیتے ہیں؛ مگر محمد حسین آزاد کی انشاپردازی کو لفاظی قرار دیتے ہیں اور آزاد کی تحقیقی صلاحیت اور تنقیدی اہلیت کو بالکل تسلیم نہیں کرتے۔ وہ تذکروں کی تاریخی اہمیت کے قائل ہیں؛ اسی لیے ''آب حیات'' کے علاوہ ''گل رعنا'' اور ''شعر الہند'' کا بھی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں کہ ان تینوں میں اردو زبان کی تاریخ کا کچھ زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔ ''گل رعنا'' کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ مصنف نے ''آب حیات'' کی قیاس آرائیوں کو نشانہ بنانے کے باوجود بڑی حد تک ''آب حیات'' سے ہی استفادہ کیا ہے۔ واقعہ نگاری اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی یہ ''آب حیات'' جیسی اہمیت کی حامل نہیں۔ عبدالسلام ندوی کی ''شعر الہند'' سے کلیم الدین احمد کو زیادہ توقعات تھیں؛ مگر اس کے مطالعے نے بھی کلیم الدین احمد کو مایوس کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ''گل رعنا'' سے بھی کم تر ہے۔ بیان میں صفائی، ترتیب اور تناسب کی ایسی کمی ہے کہ اس کتاب کو پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے۔ گویا کلیم الدین احمد کو پرانے اور نئے تذکرے تنقیدی لحاظ سے یکساں طور پر مایوس کرتے ہیں، البتہ تاریخی اعتبار سے یہ ان کی نظر میں اہم ہیں؛ اس لیے وہ انہیں خام مواد بتاتے ہیں اور ہم عصر ناقدین کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اس خام مواد کی مدد سے تنقید وتحقیق کی نئی عمارت تعمیر کریں۔

کلیم الدین احمد نے حالی کی تنقید نگاری پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ حالی کو تنقید کا بانی، بہترین نقاد، مخلص اور بلند پایہ نثر نگار تسلیم کرتے ہیں؛ مگر نئے تنقیدی اصولوں سے ناواقف،

سطحی فکر ونظر اور اوسط دماغ وشخصیت کا حامل ادیب بھی قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے حالی کے تعلق سے بہت تلخ جملے کہے اور ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں پیش کردہ حالی کے خیالات وتصورات کی تردید بھی کی؛ مگر کہیں کہیں اپنے بیان کو خود ہی تضادات کا شکار بھی بنا دیا۔ ایک جگہ تو ذکر کرتے ہیں کہ حالی نے صاف اور سادہ طرز ادا ایجاد کی مگر فوراً ہی یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ زبان کے معاملے میں حالی نے کوئی اجتہاد نہیں کیا۔ اسی طرح ایک طرف حالی کو ''خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم وادراک معمولی، غور وفکر ناکافی'' جیسے اوصاف سے متصف کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کر کے بنیادی اصولوں پر غور وفکر کیا، شاعری کی ماہیت پر روشنی ڈالی... وہ اردو تنقید کے بانی تھے اور بہترین نقاد بھی''۔ (ص: ۸۹)

ان تضادات سے قطع نظر کلیم الدین احمد، حالی کے پیش کردہ تنقیدی تصورات کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں اور شعر کی ماہیت، اخلاق اور شاعری، شاعری کے لیے تین شرائط اور شعر کی خوبیوں وغیرہ کے سلسلے میں حالؔی کے نظریات سے کہیں اختلاف کرتے ہیں اور کہیں اس میں ترمیم واضافہ کرتے ہیں۔ آخر میں یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ:

''حالی کی اہمیت تاریخی ہے.... ادبی نقطۂ نظر سے اگر کوئی چیز دائمی ہے تو وہ شاعری نہیں، تنقید بھی نہیں، حالؔی کی نثر ہے''۔ (ص: ۱۱۳)

تنقید میں حالی سے بے اطمینانی کی سب سے بڑی وجہ جو کلیم الدین احمد کو نظر آتی ہے، وہ حالؔی کی مغربی اصولوں سے کم واقفیت ہے۔

شبلی کے تعلق سے بھی کلیم الدین احمد کے خیالات تقریباً ایسے ہی ہیں، جیسے حالی کے متعلق۔ وہ شبلی کے مطالعے کو مشرقی ادب تک محدود قرار دے کر انہیں مغربی ادب سے ناواقف سمجھتے ہیں، البتہ شبلی نے تخیل اور اس کے بعض پہلوؤں کی جو تعریف کی ہے، اسے مفید قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے شبلی کے دوسرے بنیادی خیالات مثلاً احساس وادراک، محاکات وتخیل، الفاظ ومعانی اور بلاغت کے تعلق سے بھی سرسری طور پر بحث کی ہے؛ مگر ان مباحث میں شبلی کے مطالعے اور مہارت پر انہیں شبہ ہے۔ ''موازنہ انیس ودبیر'' کو شبلی کا اہم کارنامہ قرار دیتے ہیں، جس کا اثر ان کی نگاہ میں ''شعر العجم'' سے زیادہ دیرپا رہا ہے۔

کلیم الدین احمد نے عبدالحق کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور انہیں بنیادی طور پر ایک محقق قرار دیا ہے۔ ''باغ وبہار'' کی صحیح دریافت کا سہرا ان کے سر باندھتے ہوئے بحیثیت محقق کلیم الدین احمد نے عبدالحق کی اچھی خاصی تعریف کی ہے، البتہ مثنوی ''خواب وخیال'' کی دریافت پر عبدالحق کی خوشی کو وہ انسانی کمزوری بتاتے ہیں؛ مگر ان کی تنقیدی نگاہ کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بغیر تنقید کے تحقیق ان کی نگاہ میں گمراہی پیدا کرتی ہے؛ اس لیے وہ تحقیق سے زیادہ بیش قیمت صنف تنقید کو قرار دیتے ہیں۔ انہیں گلہ ہے کہ عبدالحق کی تنقید صرف مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے، وہ انگریزی، یا مغربی اصول تنقید سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ عبدالحق کی تنقید پر انہیں حالؔی کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے؛ اس لیے حالی اور عبدالحق کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حالی زیادہ لائق تحسین ہیں۔ اپنے زمانے میں انہوں نے جو کچھ کیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ زیادہ آزادئ فکر رکھتے تھے اور ان کی شخصیت بھی بلند تر تھی۔ عبدالحق صاحب کے سامنے زیادہ وسیع میدان تھا؛ لیکن انہوں نے اس میدان میں تابمقدور تگ ودو نہیں کی، اپنی صلاحیتوں سے پورا کام نہیں لیا۔ نئی نئی معلومات کی طرف توجہ نہیں کی۔ وہ حالؔی کی لکیر پر چلتے رہے۔ نقاد کی حیثیت سے وہ حالؔی کے دوش بدوش نہیں چلتے ہیں؛ بلکہ مودبانہ طور پر، سعادت مند شاگرد کی طرح پیچھے پیچھے چلتے ہیں''۔ (ص: ۱۳۷)

نویں باب میں کلیم الدین احمد نے ''پیروئ مغرب'' کے عنوان کے تحت تین نقادوں عبدالرحمٰن بجنوری، محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری کی تنقیدوں کا جائزہ لیا ہے۔ انہیں شکایت ہے کہ پیروئ مغرب کا جو مشورہ آزاد اور حالی نے دیا تھا، اس کا نتیجہ بہت مضحکہ خیز ہوا، ہر مغربی خیال کو درست مان لیا گیا اور غلط موازنے کئے گئے۔ اپنی بات کی تائید میں انہوں نے مذکورہ تینوں ناقدین کا جائزہ لیا ہے۔ ''محاسن کلام غالب'' کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بجنوری کے متعلق لکھتے ہیں کہ شاعری کے جتنے محاسن مغربی فنکاروں اور انشا پردازوں نے گنائے ہیں، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر غالب کے اشعار میں نکالتے ہیں اور گیٹے، شیکسپیئر، دانتے، ورڈز ورتھ، رامبو، ملارمے، ارسطو، افلاطون وغیرہ کے جتنے اقوال واوصاف سے واقف ہیں، انہیں نقل کرتے ہیں اور غالب کی شاعری پر چسپاں کرتے ہیں۔

پیروئ مغرب کی دوسری مضحک مثال کے طور پر کلیم الدین احمد نے محی الدین قادری زور کی

کتاب ''روح تنقید'' کو پیش کیا ہے۔ وہ اولاً تو اس کتاب کو ایک طالب علمانہ کاوش بتاتے ہیں۔ دوسرے کتاب میں پیش کردہ مغربی تصانیف سے ماخوذ خیالات کو بے ترتیب اور باہم متضاد قرار دیتے ہیں۔کلیم الدین احمد کا کچھ ایسا ہی خیال عبدالقادر سروری کی کتاب ''دنیائے افسانہ'' کے تعلق سے بھی ہے۔ان کا خیال ہے کہ سروری صاحب نے افسانے پر چند کتابیں انگریزی زبان میں دیکھیں اور ساری باتیں انہیں کتابوں سے اخذ کر لی ہیں۔وہ کتابیں بھی پرانی اور فرسودہ ہیں، حالات حاضرہ اور نئے زمانے کے تعلق سے ہونے والی تبدیلیوں کا ان میں کچھ ذکر نہیں۔گویا مذکورہ تینوں کتابوں کے حوالے سے کلیم الدین احمد نے پیرویٔ مغرب کی مضحک مثالیں پیش کی ہیں اور نئی چیز سے متاثر ہو کر فوراً اسے اپنا لینے کے عمل کو غلط قرار دیا ہے۔

کلیم الدین احمد نے ترقی پسند تحریک اور ادب پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کی بنیاد میں جو کجی ہے، اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ اس تحریک کے دو حصے ہیں: ایک حصہ نظریات پر مشتمل ہے، جب کہ دوسرا اس ادب پر جو ان نظریات کے فروغ کے لیے لکھا جاتا ہے۔کلیم الدین احمد کی نگاہ میں ترقی پسند ادب غیر اطمینان بخش اور ادبی محاسن سے خالی ہے۔ترقی پسند ادیبوں کا عزم قابل تعریف ہے؛ مگر انہیں آزادی حاصل نہیں کہ وہ نظریے سے ہٹ کر کچھ کہہ سکیں؛ اس لیے ترقی پسند ادب میں چند اشتراکی خیالات کی تکرار ہوتی ہے اور بس۔اس ادب کا تعلق دیگر علوم مثلاً نفسیات، فنون لطیفہ وغیرہ سے بھی برائے نام ہے۔یہ ادب سیاسی مفادات کے حصول کے لیے لکھا جاتا ہے؛ اس لیے وہ اس ادب کو پروپیگنڈہ سے موسوم کرتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کو ترقی پسند ادب میں ایک بڑا نقص یہ نظر آتا ہے کہ یہ ادب بغیر غور و فکر کے تخلیق پاتا ہے۔اس میں ادبیت کے بجائے جذباتی اور دماغی بوکھلاہٹ ہوتی ہے۔اس کے لکھنے والے نیم طبیب کی طرح ایک ہی دوا سے ہر مرض کا علاج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مزید یہ کہ نہ ان کے تصورات میں جدت ہوتی ہے اور نہ طرز ادا میں انفرادیت۔وہ الفاظ، فقروں اور جملوں کا استعمال بغیر سمجھے بوجھے کرتے ہیں۔کلیم الدین احمد اشتراکیت کا بھی تفصیلی جائزہ لیتے ہیں اور وہ اسے ایک حیوانی نظریۂ حیات قرار دیتے ہیں، جو انسانی دماغ کے بنیادی مطالبوں اور تقاضوں کو سراسر فراموش کرتا ہے۔ترقی پسند مصنفین کے مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ اپنے اشتراکی خیالات اور نظریوں کو ادب پر حاوی کر دیتے ہیں، جب کہ آرٹ کو پہلے آرٹ ہونا چاہیے، پھر کچھ اور۔

ترقی پسند تنقید کے عمومی جائزے کے بعد کلیم الدین احمد نے چند ترقی پسند ناقدین کا خصوصی جائزہ لیا ہے، جس میں اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، محمد حسن شامل ہیں؛ مگر اس سے قبل آیئے آل احمد سرور کی تنقید پر کلیم الدین احمد کے خیالات کا جائزہ لیں، جو بہت تفصیل کے ساتھ تقریباً ۶۵ صفحات پر مشتمل ہیں۔کلیم الدین احمد کو آل احمد سرور سے کئی شکایتیں ہیں۔مثلاً ایک تو شکوہ ہے کہ سرور صاحب نے کوئی مفصل یک موضوعی کتاب نہیں لکھی، صرف مجموعۂ مضامین ہی پیش کیے ہیں۔دوسرا شکوہ یہ ہے کہ وہ اپنی تمہید اور دیباچوں میں خودستائی اور خودنمائی سے کام لیتے ہیں۔تیسری شکایت یہ ہے کہ وہ اپنی رائے کو باتوں یا مثالوں سے واضح کرنے میں تن آسانی سے کام لیتے ہیں۔چوتھی خامی یہ ہے کہ وہ اردو اور انگریزی شعرا و ادبا کا موازنہ کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر غلط فہمی پھیلاتے ہیں۔پانچویں کمی یہ ہے کہ وہ ایک ہی سانس میں ہاں اور نہیں دونوں بولتے ہیں؛ یعنی دوٹوک اور فیصلہ کن بات کہنے سے گریز کرتے ہیں۔چھٹی شکایت یہ ہے کہ آل احمد سرور نے بہت سارے شعرا کی تنقید میں جانبداری سے کام لیا ہے اور آخری شکوہ یہ بھی ہے کہ وہ تنقید کی زبان نہیں استعمال کرتے اور شعوری طور پر اردو ادب کی خامیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔یہ سارے شکوے کلیم الدین احمد نے آل احمد سرور کے اقتباسات، سجاد انصاری، اختر شیرانی، مولانا سہیل وغیرہ کے مطالعے اور غالب، شاعری، فکشن وغیرہ پر ان کی تحریروں سے اخذ کردہ عبارتوں کے حوالے سے مدلل انداز میں پیش کیے ہیں۔ان آرا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان میں سے کئی کمیاں خود کلیم الدین احمد کی تنقید میں دکھائی جا سکتی ہیں؛ مگر انہوں نے جس دقت نظر کے ساتھ آل احمد سرور کی تنقید کا محاکمہ کیا ہے، وہ تنقیدی گفتگو کی عمدہ مثال ہے۔انہیں آل احمد سرور کی تنقید میں کئی مثبت چیزیں بھی دکھائی دی ہیں، جس کی بنا پر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرور صاحب کی تنقیدی آرا میں زیادہ وضاحت اور قطعیت پیدا ہوگئی ہے۔

جیسا کہ ترقی پسند تنقید کے باب میں ذکر کیا گیا، کلیم الدین احمد ترقی پسند ناقدین اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور محمد حسن کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔بقول کلیم الدین احمد: اختر حسین رائے پوری ترقی پسند ادب کے سب سے پہلے علمبردار ہیں، جن کا مقالہ ''ادب اور زندگی'' نشان راہ کہلانے کا مستحق ہے۔ان کے خیال میں اختر رائے پوری کی تنقید مکمل طور پر مارکسی خیالات کے گرد گھومتی ہے اور وہ ادبی مسائل کو نظرانداز کر کے مارکسی نظریات کی تشہیر پر زور دیتے

ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کو بھی وہ روسی ادب کا مداح قرار دیتے ہوئے انہیں بھی مارکسی نظریات کا مبلغ بتاتے ہیں؛ مگر مجنوں کی تنقید اختر رائے پوری کی تنقید کی طرح ادھ کچرے فلسفے کا ڈ کار نہیں۔ اختر کے یہاں تنقیدی توازن کا فقدان ہے، جب کہ مجنوں کی تنقید میں توازن ملتا ہے۔ کلیم صاحب کو مجنوں گورکھپوری کی انگریزی ادب سے واقفیت پر بھی شبہ ہے۔ مجموعی طور پر وہ مجنوں کی تنقید کو متوازن اور اختر رائے پوری سے بہتر سمجھتے ہیں؛ اس لیے ان کی کئی باتوں مثلاً ماضی کے فن پاروں کو آج بے وقت کی راگ بتانا، اقتصادیات کو کل زندگی کے بجائے محض زندگی کا ایک پہلو قرار دینا وغیرہ سے اتفاق کرتے ہوئے تعریف بھی کرتے ہیں؛ مگر یہ شکایت بہرحال برقرار رہتی ہے کہ وہ خود ان باتوں کا برابر خیال نہیں رکھتے۔

احتشام حسین کو ترقی پسند ناقدین میں کلیم الدین احمد نے اہم حیثیت دی ہے؛ اس لیے ان پر بڑی تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان سے بھی کلیم الدین احمد کو مجنوں اور اختر کی طرح بہت ساری اور تقریباً یکساں شکایتیں ہیں۔ خودنمائی اور خود پرستی احتشام حسین کی ایک بڑی کمی ہے، جس کی طرف کلیم الدین احمد سب سے پہلے اشارہ کرتے ہیں اور آل احمد سرور کی طرح ان سے بھی مفصل اور یک موضوعی کتاب نہ لکھنے کا شکوہ کرتے ہیں۔ ترقی پسند مسائل کے متعلق جو کچھ احتشام حسین نے لکھا ان سے کلیم الدین احمد مطمئن نہیں ہوتے؛ بلکہ انہیں منتشر باتیں بتاتے ہیں۔ احتشام حسین کے کئی اقتباسات پیش کر کے وہ انہیں مارکس سے مستعار نظریات ثابت کرتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ وہ مارکسی ہی سہی؛ مگر کوئی اصول نقد معین نہیں کر سکے۔ گویا کلیم الدین احمد کو اختر رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین تینوں کے یہاں اصولی باتوں کی تلاش میں یکساں ناکامی حاصل ہوتی ہے۔

''اردو تنقید پر ایک نظر'' کے پہلے ایڈیشن میں محمد حسن کا ذکر نہیں کیا گیا تھا، چوں کہ کلیم الدین احمد کی نگاہ میں محمد حسن، احتشام حسین کے پیرو اور مدح خواں تھے؛ مگر جب احساس ہوا کہ انہوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالنے کی کوشش کی ہے اور مارکسی و ہیئتی تنقید میں مفاہمت کی بھی سعی کی ہے تو بعد کے ایڈیشن میں محمد حسن پر انہوں نے ایک باب قائم کیا۔ کلیم الدین احمد کے بقول محمد حسن نے مارکسی نظریہ کو دوسرے ناقدین کے مقابلے میں زیادہ توازن اور اعتدال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ محمد حسن کی اس خوبی کی بھی تعریف کرتے ہیں کہ وہ اپنی کمزوریوں اور حدود کا اعتراف کر لیتے ہیں اور یہ احساس دلانے میں کامیاب ہیں کہ اب ترقی پسندوں کی نگاہ میں ادب محض پروپیگنڈہ نہیں، کچھ چیزے دگر بھی ہے۔

پہلے ایڈیشن میں اردو ادب کی تاریخوں اور تبصروں کو بھی کلیم الدین احمد نے موضوع بحث بنایا ہے۔ پہلے وہ تاریخوں پر گفتگو کرتے ہیں اور بیک قلم اردو کی تمام تاریخوں کو مسترد کرتے ہوئے انہیں ناقص غیر تشفی بخش اور غیر جامع قرار دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں جو تاریخیں بھی لکھی گئیں ہیں، ان میں انفرادی تحقیق و تنقید کا وجود نہیں ہے؛ بلکہ دو چار کتابوں سے استفادہ کر کے ایک کتاب تیار کر دی گئی ہے۔ رام بابو سکسینہ سے اعجاز حسین تک ہر تاریخ کا ماخذ صرف ''آب حیات'' رہی ہے۔ ان کی نگاہ میں اعجاز حسین تنقیدی نگاہ نہیں رکھتے اور رام بابو سکسینہ طلبہ کی حد تک مفید ہیں بس۔ آخر میں انہوں نے اچھی تاریخ نویسی کے لیے کچھ مشورے بھی دیئے ہیں۔ آگے چل کر تاریخ کو غالباً انہوں نے تنقید کا حصہ نہیں مانا؛ اس لیے بعد میں یہ گفتگو کتاب سے حذف کر دی گئی۔

تبصرہ نگاری کلیم الدین احمد کی نگاہ میں تنقید کی ہی ایک شاخ ہے۔ اردو تبصرہ نگار چوں کہ اصول نقد سے ناواقف ہیں؛ اس لیے تبصرہ نگاری میں بھی انہیں کامیابی نہیں ملی۔ ان کی نگاہ میں تبصرے ایسے ہونے چاہیں کہ اس میں کتاب کی اہم ترین خصوصیتیں واضح ہو جائیں۔ تبصرہ کا مقصد ہے کسی جوہر کا پتہ لگانا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے، جب مبصر کے پاس تنقید کا صحیح معیار موجود ہو۔

''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں مذکورہ ابواب کے علاوہ چند ضمیمے بھی شامل ہیں۔ جن میں رشید احمد صدیقی کی تنقید، عزیز احمد اور علی سردار جعفری کی کتابوں بہ عنوان ''ترقی پسند ادب'' اور ''تاثراتی تنقید'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے تعلق سے کلیم الدین احمد کو یہ اعتراف ہے کہ رشید صاحب نے بعض بنیادی مسائل پر توجہ کی ہے۔ شعر، شاعری اور شاعر پر بحث کی ہے اور انگریزی سے بھی استفادہ کیا ہے؛ مگر ان کے خیالات میں رومانیت کی جھلک ہے اور وہ حقائق سے دور بھاگتے ہیں۔ انہیں شاعری کی ماہیت کا اندازہ نہیں؛ اس لیے اس کی قدر و قیمت صحیح طور پر متعین کرنے میں ناکام ہیں۔ مقدمہ باقیات فانی اور طنزیات و مضحکات کے حوالے سے انہوں نے کہا ہے کہ ان کی کتابوں میں بے موقع محل بھی بہت ساری چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ مطمح نظر کی تنگی، دماغی کاہلی اور معیار کی کمی سے ان کے یہاں عجیب نتائج ظاہر ہوتے ہیں؛ مگر جب وہ دماغی کاہلی سے آزاد ہو کر لکھتے ہیں تو ان کی تنقید اعلیٰ ہوتی ہے۔ اس ضمن میں رشید صاحب کی اکبر پر کی گئی تنقید اور اردو شعرا کے بارے میں ان کی رائے کو وہ قابل قدر بتاتے ہیں۔

عزیز احمد کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے عزیز احمد کی بعض

تحریروں کو اچھی تنقید کی مثالیں بتاتے ہیں۔ان کی نظر میں یہاں وہ تکرار نہیں، جو عام مارکسی ناقدین کے یہاں ملتی ہے۔عزیز احمد کی تنقید میں توازن، آزاد خیالی اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے کام کی باتیں بھی مل جاتی ہیں۔عزیز احمد چوں کہ ترقی پسند ادبا شعرا کے یہاں انتہا پسندی کو نشانہ بناتے ہیں، معاش ہی کو تمام مسائل کا حل ماننے سے انکار کرتے ہیں اور مارکسی نظریات کی خامیوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں؛ اس لیے کلیم الدین احمد کی نگاہ میں وہ پسندیدہ ہیں اور ان کی عملی تنقید کے سلسلے میں چند باتوں سے اختلاف کرتے ہوئے بھی، تنقیدات کو بنظر تحسین دیکھتے ہیں۔

علی سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' کو کلیم الدین احمد تنقید کے بجائے تاثرات قرار دیتے ہیں۔ان کی نگاہ میں علی سردار جعفری کے ذہن کا دروازہ بند ہے اور دماغ میں مارکسی کجی نے جگہ بنالی ہے۔حسن اور موضوع پر بحث کرتے ہوئے کلیم الدین احمد جعفری سے شدید اختلاف کرتے ہیں اور ان کے اقوال میں تضادات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

ضمیمے کی تیسری بحث تاثراتی تنقید کے تعلق سے ہے، جس میں انہوں نے فراق گورکھپوری اور حسن عسکری کے حوالے سے اس تنقید کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔وہ تاثراتی تنقید کو تنقید ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اسے پوری طرح ناقد کی دماغی ساخت اور موڈ پر منحصر قرار دیتے ہیں۔ایسی تنقید میں سنجیدگی، سوجھ بوجھ، ضبط اور احتیاط کا فقدان ہوتا ہے۔فراق کی کتاب ''اندازے'' سے متعدد مثالیں پیش کر کے وہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں اور زبردستی حیات کے مسائل، کائنات اور کلچر کو اپنی تنقید میں کھینچ لاتے ہیں، البتہ جب ذرا سنبھل کر بات کرتے ہیں تو اچھی، باریک اور گہری باتیں کر جاتے ہیں۔محمد حسن عسکری کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ان کی تنقید غیر ذمہ دارانہ، غیر ناقدانہ اور محض تاثرات پر مبنی ہوتی ہے۔وہ حسن عسکری کے مغربی ادب کے وسیع مطالعے اور صلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں؛ مگر انہیں شکوہ ہے کہ عسکری اپنی صلاحیتوں اور مطالعے کا درست استعمال اپنی تنقید میں نہیں کر پاتے۔

کلیم الدین احمد نے کتاب کے آخر میں جدیدیت کو عہد بہ عہد تبدیلی اور نئے تجربات سے موسوم کیا ہے۔وہ جدیدیت کی بنیاد وجودیت کو قرار دیتے ہیں اور اس کے چند نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے وجودیت کے صرف ایک پہلو پر زور دیتے ہیں، جو سارتر کے فلسفے کا نچوڑ ہے۔یہاں انہوں نے وجودیت کے ایک بڑے مذہبی مبلغ کر کیگارد کے نظریات سے یکسر صرف نظر کر کے ادھورا اور یک رخا مطالعہ پیش کیا ہے۔کلیم الدین احمد کو جدید ناقدین سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے بذات خود

وجودیت کا مطالعہ نہیں کیا؛ بلکہ سنی سنائی باتوں کو کافی سمجھ لیا ہے؛ اسی لیے وہ جدید ناقدین میں صرف شمس الرحمٰن فاروقی کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کی زبان، مطالعے کی وسعت اور تنقیدی صلاحیت کی تعریف کرتے ہیں۔نیز یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی تنقید میں اکثر کام کی باتیں مل جاتی ہیں۔شمس الرحمان فاروقی کے طرز تنقید، طرز استدلال اور مضامین کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد وہ ان سے خوب سے خوب تر کی توقع ظاہر کرتے ہیں، جسے شمس الرحمان فاروقی نے مستقبل میں پورا کر کے دکھایا ہے۔

مجموعی طور پر ''اردو تنقید پر ایک نظر'' کلیم الدین احمد کی ایک اہم تصنیف ہے، جس میں انہوں نے بڑی بے باکی سے غیر جانبدارانہ اور سائنٹفک انداز میں ابتدا سے عہد جدید تک کے تمام تنقیدی رجحانات، روایات اور تنقیدی سرمایے کا محاسبہ کیا ہے۔انہوں نے شروع میں اردو میں تنقید کے وجود سے انکار کرتے ہوئے اسے اقلیدس کا خیالی نکتہ، یا معشوق کی موہوم کمر بتایا تھا۔بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے اس قول کی وضاحت میں انہوں نے مکمل کتاب لکھ ڈالی؛ مگر غور کیا جائے تو اس کی تہہ میں نئے تنقیدی سوتے پھوٹتے ہیں اور جا بجا تنقیدی اصول وضوابط اور ادبی تشریح و وضاحت کی ایسی عمدہ مثالیں ملتی ہیں، جنہوں نے اردو تنقید کو نئی راہ دکھائی اور ناقدین کو ضبط، حزم اور احتیاط سے لکھنے کا راستہ دکھایا۔یہ کتاب اردو تنقید کی تاریخ میں ایسا روشن منارہ ثابت ہوئی، جو کلیم الدین احمد کے مذکورہ جملے کی خود تردید کرتی ہے اور اردو کی پیشانی سے موہوم تنقید کا داغ دھو ڈالتی ہے۔اس کتاب میں جا بجا ایسے ٹکڑے، فقرے اور دلائل پیش ہوئے ہیں، جو تنقید کی مستقل کتابوں اور بڑے بڑے مضامین پر بھاری ہیں۔اسی طرح ادب، شعر، شاعر، تحقیق وتنقید کے مابین رشتہ، آرٹ کا مقصد، ادب اور زندگی میں رشتہ، تنقیدی زبان واسلوب کی اہمیت اور تجربات واحساسات وغیرہ کے حوالے سے جو نکات سامنے آئے ہیں، انہوں نے مختلف تحریکات، نظریات اور ناقدین کو نہ صرف خود احتسابی پر مجبور کیا؛ بلکہ اردو تنقید کی بنیاد کو مضبوط کرنے میں بھی تعاون دیا۔مختصر یہ کہ حالی کی ''مقدمہ شعر وشاعری'' کے بعد کلیم الدین احمد کی اس کتاب کے اثرات اردو تنقید پر مثبت اور بہتر مرتب ہوئے۔کلیم الدین احمد سے اختلاف کیا جائے، یا اتفاق، اس کتاب کے حوالے سے وہ بہر حال ہماری ادبی تاریخ کا ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔

۴۔اردو زبان اور فن داستان گوئی

''اردو زبان اور فن داستان گوئی''، کلیم الدین احمد کی وہ مستقل تصنیف ہے، جس میں انہوں

نے ماقبل کتابوں سے زیادہ متوازن رویہ اور نسبتاً کم جارحانہ تنقیدی موقف اختیار کیا ہے۔ اس میں انہوں نے طویل، مختصر اور منظوم داستانوں پر عملی تنقید بھی پیش کی ہے۔ فن داستان گوئی پر بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے انہوں نے کہانیوں کی اہمیت اور افادیت سے روشناس کرایا ہے اور داستان کو تفریح کا ایسا ذریعہ قرار دیا ہے، جو پڑھنے والوں میں تجسس کا مادہ پیدا کرتی ہے اور ذہنی نشو ونما میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: داستان میں بحیثیت فن بہت سی کمیاں ہوتی ہیں، مثلاً واقعات ناقابل وثوق ہوتے ہیں، واقعات کی ترتیب غیر منطقی ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ؛ مگر یہ دلچسپی کا بہترین مشغلہ ہے۔ اس قسم کے دل بہلانے والے مشغلوں کی ضرورت ہر زمانہ میں انسانوں کو رہی ہے۔

کلیم الدین احمد نے داستانوں کے مطالعہ میں مختلف زاویوں سے کام لیا ہے؛ مگر داستانوں کی ساحرانہ اور طلسمی فضا کو قدرے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کے بقول داستانیں ہماری زندگی کی یکسانیت، ناکامیوں، تمناؤں اور حسرتوں کی پناہ گاہ ہیں، جو ہمیں وقتی طور پر خوابوں کی ایسی دنیا میں لے جاتی ہیں، جہاں زندگی کی ساری کلفتیں، سارے تضادات ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ خیالی دنیا اگرچہ ماورائی ہوتی ہے؛ مگر اس میں تہذیب، معاشرہ اور زندگی کی نشو ونما کی تفصیلات کا تعلق اپنے ملک، معاشرے اور قوم سے ہوتا ہے، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ داستانیں کسی قوم کی اجتماعی اور انفرادی کاوشوں کی پہچان کراتی ہیں۔

کلیم الدین احمد داستان کے بنیادی عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا معیار ''فوری حسن'' کو ٹھہراتے ہیں؛ یعنی داستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ فوراً سمجھ میں آجائے، دلچسپ ہو اور بغیر غور وفکر کے اس کا حسن سامنے آجائے۔ داستان کے ہیرو کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ اس کا اعلیٰ طبقے کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً بادشاہ، شہزادہ، نواب وغیرہ؛ تاکہ اس کی وجہ سے شان وشوکت، رنگینی اور رزم وبزم کے واقعات بہ آسانی شامل کئے جاسکیں۔ داستان کے دوسرے عنصر کے طور پر وہ ''عشق'' کا ذکر کرتے ہیں اور تصویر دیکھ کر، ذکر سن کر، یا جھلک پا کر عاشق ہونا انہیں اس وقت کے لحاظ سے خلاف فطرت نہیں معلوم ہوتا ہے۔ مافوق الفطرت کردار اور واقعات کو بھی وہ داستان کا اہم جزو بتاتے ہیں اور انہیں سامعین یا قارئین کے اندر تجسس ودلچسپی پیدا کرنے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ مافوق الفطرت کردار، یا محیر العقول واقعات کی بنا پر داستانوں کی اہمیت سے منکر ہونا کلیم الدین احمد کے نزدیک درست نہیں؛ کیوں کہ یہ صرف اردو تک محدود نہیں۔ محیر العقول واقعات اور مافوق الفطرت کردار دنیا کی تمام زبانوں کی داستانوں کا حصہ رہے ہیں۔ داستان کے اصول اور

اجزائے ترکیبی کی وضاحت کے لیے انہوں نے خواجہ امان دہلوی کا ایک اقتباس بھی پیش کیا ہے۔

کلیم الدین احمد نے کئی اہم نثری وشعری داستانوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے، جس میں سب سے پہلے وہ ''طلسم ہوش ربا'' کو موضوع بناتے ہیں اور داستان امیر حمزہ کو اردو میں داستان گوئی کی معراج قرار دیتے ہیں۔ ''طلسم ہوش ربا'' کو کلیم الدین احمد نے افسانوں، ناولوں اور مرثیوں پر ترجیح دی ہے۔ افسانے اور ناولوں کے تعلق سے تو ان کی تنقید عمومی ملتی ہے؛ مگر مرثیے کو وہ طلسم ہوش ربا کے مقابلے میں صرف اس لیے پست ٹھہراتے ہیں کہ نیکی اور بدی کے مابین کرداروں کا مقابلہ برابری کا نہیں ہے۔ مرثیہ میں مرثیہ نگار اور قارئین دونوں کی ہمدردی صاف طور پر شہدائے کربلا کے ساتھ ہوتی ہے اور ہمدردی وعقیدت کے جوش میں دوسرے کو کمتر دکھایا جاتا ہے، جب کہ ''طلسم ہوش ربا'' کے اچھے اور برے کرداروں میں شجاعت اور بہادری کا توازن برابر رہتا ہے؛ اس لیے تصادم زبردست ہے؛ مگر ''طلسم ہوش ربا'' کے انہیں کرداروں کو وہ شیکسپیئر کے کرداروں سے کم تر قرار دیتے ہیں اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ شیکسپیئر کے ڈراموں میں جہاں نیکی وبدی کے عناصر ایک ہی کردار کے اندرون میں اپنی جنگ جاری رکھتے ہیں اور کردار ایک طرح کی کشمکش سے دوچار رہتا ہے، وہیں ''طلسم ہوش ربا'' میں نیکی اور بدی دو گروہ کے کرداروں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ ''طلسم ہوش ربا'' میں اندرونی اور نفسیاتی کشمکش پہ کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ انہوں نے طلسم ہوش ربا کی دیگر کمزوریوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ مثلاً وحدت کی کمی، عضویاتی نمو اور ترتیب وتنظیم کا فقدان، تخیل کی بے لگامی اور غیر ضروری چیزوں کی تکرار وطوالت وغیرہ۔ وہ اس کی زبان کو سادہ، بے تکلف کے ساتھ مصنوعی بھی قرار دیتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کو ''بوستان خیال'' میں بھی وہ تمام نقائص دکھائی دیتے ہیں، جو ''طلسم ہوش ربا'' میں موجود تھے۔ ادبی اعتبار سے بھی یہ ''طلسم ہوش ربا'' سے بہتر نہیں؛ مگر نسبتاً اس میں اعتدال، انتخاب اور اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ انہوں نے اس کی دو خصوصیات خاص طور پر بیان کی ہیں: اوّل یہ کہ یہ داستان حقیقی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے، قصہ مصنوعی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ میر تقی کے علم وفضل کی وجہ سے اس میں ایک علمی فضا ملتی ہے۔ یہاں وہ غلطیاں نہیں دہرائی گئی ہیں، جو ''طلسم ہوش ربا'' کا حصہ تھیں۔ دسویں باب میں کلیم الدین احمد نے ظرافت کو بھی داستان کا اہم عنصر قرار دیا ہے۔ یہ عنصر ''داستان امیر حمزہ'' اور ''بوستان خیال'' دونوں میں موجود ہے۔

طویل داستانوں کے بعد کلیم الدین احمد مختصر داستانوں کو منتخب کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ان

کی نگاہ ''باغ و بہار''، ''آرائش محفل'' اور ''فسانہ عجائب'' پر ٹھہرتی ہے۔اس سے قبل وہ اسلوب اور انداز بیان کو قصہ گوئی کا بنیادی وصف قرار دے چکے تھے؛ اس لیے ''باغ و بہار'' کو اس کے اسلوب کی بنا پر ''آرائش محفل'' پر فوقیت دیتے ہیں۔''باغ و بہار'' کی اسلوبی خصوصیات مثلاً صفائی، سادگی اور روانی کے مقابلے میں ''آرائش محفل'' کی تصنع نما انشا انہیں بدنما لگتی ہے۔اسی طرح مصنوعی اور پر تکلف نثر کی وجہ سے ''فسانہ عجائب'' سے بھی وہ نالاں نظر آتے ہیں اور اس کی نثر کو عجوبۂ روزگار قرار دیتے ہیں۔

منظوم داستانوں کے لیے انہوں نے ''سحرالبیان'' اور ''گلزار نسیم'' کا انتخاب کیا ہے۔منظوم قصہ زیادہ اختصار اور صفائی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے، مگر کلیم الدین احمد کو اس پر اعتراض ہے کہ جب کوئی چیز نثر میں بطریق احسن بیان ہو سکتی ہے تو اس کے لیے نظم کیوں۔داستان دراصل لکھنے سننے کا فن ہے تو اس کے لیے نثر زیادہ موزوں ہے۔مختصر داستانوں کے لیے مثنوی شاید موزوں فارم نہیں ہے۔''سحرالبیان'' اور ''گلزار نسیم'' کا موازنہ وہ ''باغ و بہار'' سے کرتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''باغ و بہار'' میں زیادہ تاثیر اور ڈرامائی شان ہے، جب کہ گلزار نسیم میں لفظی بازیگری سے قطع نظر انہیں جذبات نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔انہیں شکایت ہے کہ اردو شعرا مثنویوں میں شاعری کے نمونے تو پیش کرتے ہیں؛ مگر نفس قصہ سے بے اعتنائی برتتے ہیں، جب کہ داستان میں سب سے اہم قصہ ہی ہوتا ہے۔گویا دونوں مثنویاں کلیم الدین احمد کی نگاہ میں بحیثیت منظوم داستان نثری داستانوں کے مقابلے میں معیار پر پوری نہیں اترتیں۔

آخری باب میں انہوں نے داستانوں کو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ قرار دیتے ہوئے شعرا اور انشا پردازوں کو اس ذخیرہ کی قیمتی چیزوں سے استفادہ کی ترغیب دی ہے۔اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کلیم الدین احمد اردو کے پہلے نقاد ہیں، جنھوں نے کلی طور پر نہ صرف داستان کے اطراف کو سمجھا؛ بلکہ اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے اردو کی اہم داستانوں کا تنقیدی جائزہ مدلل طور پر نہایت توازن کے ساتھ اس طرح لیا کہ نہ صرف ان کی اہمیت وافادیت واضح ہوئی؛ بلکہ ان داستانوں پر گفتگو کے دروازے کھلے۔اس کتاب کے بعد ہی اردو میں داستانوں کو موضوع بنایا گیا اور کئی اہم تحقیقی مقالے منظر عام پر آئے۔

۵۔تحلیل نفسی اور ادبی تنقید

''تحلیل نفسی اور ادبی تنقید'' کلیم الدین احمد کی انگریزی کتاب ہے، جو Psycho

analysis and Literary Criticism کے نام سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔اس کا اردو ترجمہ پروفیسر ممتاز احمد، سابق صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی نے کلیم الدین احمد کی زندگی میں کیا تھا؛ مگر ۱۹۹۰ء میں بہار اردو اکادمی سے شائع ہوا۔دس ابواب پر مشتمل اس کتاب میں تحلیل نفسی اور فن، نابغہ اور جنون، انفرادی فطانت کا تحلیل نفسی کے ذریعہ مطالعہ، تحلیل نفسی اور تنقید کے فرائض، نظریہ فن، فنکار اور لاشعور، ادبی اقدار، ادبی نقطۂ نظر وغیرہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔گویا ادبی تنقید میں تحلیل نفسی کے امکانات اور دخل خصوصی طور پر اس کتاب کا موضوع ہے؛ مگر کلیم الدین احمد نے کئی ابواب میں اپنے موضوع کو بھول کر صرف تحلیل نفسی پر بحث کی ہے۔کلیم الدین احمد نے تمہیدی باب میں علم نفسیات اور ادب کے ساتھ اس کے تعلقات کے علاوہ مشاہیر ادب کے ردعمل کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ ادب و فن انسانی دماغ کے بہترین کرشمات کا پرتو ہیں اور علم نفسیات کے ذریعہ بھی ان تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے؛ مگر آخری باب میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں تحلیل نفسی کے دعووں کو کھوکھلا اور نمائشی بھی بتایا ہے۔ان کا خیال ہے کہ تنقید کا کام تجربے کا موازنہ کرنا اور انہیں پرکھنا ہے اور یہی چیز تحلیل نفسی نہیں کرتی۔ماہر تحلیل نفس کسی شاعر کے گرہوں تک تو پہنچ جائے گا؛ مگر کسی فن پارے کی اصل قدر اس کی آنکھوں سے محو ہو جائے گی۔یہ سچ ہے کہ تحلیل نفسی براہ راست فن پارے کی قدر کا تعین کرنے میں اہم کردار ادا نہیں کرتی؛ مگر فنکار کی شخصیت اور فن کے مطالعے میں تحلیل نفسی کے مقام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔بہر حال کچھ مثبت اور کچھ منفی پہلوؤں کے باوجود اردو میں اپنے موضوع پر یہ کتاب منفرد، دلچسپ اور معلومات سے بھر پور قرار دی گئی، اگرچہ اس پر جتنی گفتگو ہونی چاہیے تھی، وہ آج تک نہیں ہو سکی۔

۶۔سخن ہائے گفتنی

''سخن ہائے گفتنی'' کلیم الدین احمد کی ۳۷۶ صفحات پر مشتمل ایک وقیع تصنیف ہے، جس میں ۱۹۴۴ء تک ''معاصر'' میں شائع ہونے والے ان کے مضامین اور تبصروں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی اور اس کے مضامین نے اردو تنقید پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے۔کتاب میں چھ مقالات، چھ تبصرے اور تین مضامین ہیں۔شعریت کیا ہے؟ الفاظ اور شاعری، روایات اور اردو شاعری، اقبال کا نظریہ فن، جوش کی نظم اور ایک مغربی سیاح کے خطوط، تفصیلی مقالات ہیں، جنھوں نے ''معاصر'' میں بحث کے دروازے وا کیے۔مثلاً شعریت کیا ہے؟ نوٹ کی صورت میں

آل احمد سرور کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا مضمون ہے۔آل احمد سرور نے لکھا تھا کہ ''معاصر کے حصہ نظم میں شعریت کی کمی ہے''۔اس پر کلیم الدین احمد نے سوال اٹھایا کہ شعریت کیا ہے؟ اور اپنے نقطۂ نظر سے مضمون اور اسلوب کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے شعریت کی تفہیم کروائی،اسی طرح فراق گورکھپوری نے کلیم الدین احمد کو لکھے ایک خط میں غزل کے اعتراضات کے جواب دیئے تھے۔اس خط کے جواب میں کلیم الدین احمد نے مضمون ''ایک مغربی سیاح کے خطوط'' لکھا،جس میں جون سمپل نام کے ایک فرضی کردار سے اسمتھ کو خط لکھوایا گیا ہے، پورے خط میں جون سمپل نے اپنے دوست کو اردو ادب وشاعری خصوصاً غزل کے تعلق سے اہم باتیں بتائی ہیں اور اپنے ادبی رہنما کا بھی ذکر کیا ہے۔

ان میں جن چھ کتابوں پر کلیم الدین احمد کے تبصرے شامل ہیں،ان میں پنڈت دتاتریہ کیفی کی مثنوی ''جگ بیتی''،عظمت اللہ خاں کا مجموعۂ نظم ''سریلے بول''، جاذب دہلوی کا مجموعہ نظم ''باغی''،فراق کی تصنیف ''اردو کی عشقیہ شاعری'' اور آصف علی کی تصنیف ''پرچھائیں اور اس کا دوسرا رخ'' اہم ہیں۔ان تبصروں کے علاوہ کتاب کے آخر میں مزید تین مضامین ہیں۔''اردو میں طنز وظرافت''، ''بزم نگار'' اور ''ریڈیو کلچر''۔''اردو ادب اور طنز وظرافت'' میں کلیم الدین احمد طنز اور ہجو کے فرق کو واضح کرتے ہوئے اردو ادب میں مزاحیہ ادب کی پوری تاریخ پیش کر دیتے ہیں۔''بزم نگار'' نیاز فتح پوری کے رسالہ ''نگار'' جلد ۴۱ میں شائع ہونے والا وہ تنقیدی مضمون ہے، جو نگار کے کسی شمارہ میں شائع ہونے والے خود منتخب کردہ شعرا کے کلام انتخاب پر تنقیدی رائے کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔اس میں شعرا کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے کلیم الدین احمد نے سب کی الگ الگ خصوصیات واضح کی ہیں۔کتاب کا آخری مضمون ''ریڈیو کلچر'' الگ نوعیت کا ہے۔اس میں کلیم الدین احمد سماجی مفکر کی صورت میں نظر آتے ہیں اور سائنس کے غلط استعمال اور اس کے نتائج سے قارئین کو دلائل وشواہد کے ساتھ آگاہ کرتے ہیں۔ریڈیو اور سنیما کو انہوں نے اس مضمون میں نقصاندہ ایجادات میں شمار کیا ہے، جو عوام تک ناقص علم پہنچاتے ہیں اور ان کی عادت، وقت کی بربادی کا سبب بنتی ہے۔یہ مضمون سبق آموز ہے اور کلیم الدین احمد کی ذاتی فکر کا مظہر بھی۔

۶۔عملی تنقید

''عملی تنقید''، کلیم الدین احمد کی وقیع تصنیف ہے،جس کے بارے میں آل احمد سرور نے لکھا تھا کہ ''میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ عملی تنقید ہے''۔اس کا مقدمہ زیادہ اہم ہے، جس میں

اصول نقد کی تشریح ووضاحت تقریباً دو سو صفحات میں نہایت مفصل انداز میں کی گئی ہے۔ان اصولوں کی نشاندہی کے بعد اردو شاعری کے جائزے کو انہوں نے موضوع بنایا ہے؛مگر پوری کتاب غزلوں کے مطالعے تک محدود رہ گئی ہے۔دراصل ان کا منصوبہ تھا کہ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوگی اور دوسری جلد میں قصیدوں، مرثیوں اور مثنویوں وغیرہ کا جائزہ لیا جائے گا اور ممکن ہوگا تو مزید جلدوں میں منظومات،افسانہ،ناول،تنقید وغیرہ دیگر اصناف کے نمونوں پر عملی تنقید کی جائے گی؛مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے دوسرے حصے منظر عام پر نہ آسکے اور اردو تنقید ایک بڑے اور اہم کام سے محروم رہ گئی۔

کلیم الدین احمد نے کتاب کے مقدمے میں بڑے سہل،شستہ اور صاف زبان میں تنقید کے اصول، اجزائے شعر، پیٹرن، شعری تجربے، موضوع، اسلوب اور لفظ ومعنی کے مابین رشتوں کے مباحث کو پیش کیا ہے،جن سے کلیم الدین احمد کے وسیع مطالعے،عمیق فکر اور موضوع پر ان کی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔اصول تنقید میں عملی اور تقابلی تنقید کی اعلیٰ مثالیں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کلیم الدین احمد نے غزل کے اشعار پر جو عملی تنقید پیش کی ہے،اس کی مثال اردو تنقید میں کم کم ملتی ہے۔

۷۔ادبی تنقید کے اصول

''ادبی تنقید کے اصول''، کلیم الدین احمد کے دو خطبات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۷ء میں انہوں نے سیدین میموریل ٹرسٹ کی دعوت پر خواجہ غلام السیدین کی یاد میں منعقد کئے گئے لکچر سریز میں دیئے تھے۔ان خطبات کو کتاب کی شکل میں خواجہ غلام السیدین میموریل ٹرسٹ کی جانب سے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا گیا۔اس کا مقدمہ آل احمد سرور نے لکھا ہے اور سیدین صاحب کے ساتھ ساتھ کلیم الدین احمد کے ادبی مقام ومرتبے کے متعلق بھی اپنے خیالات کھل کر پیش کئے ہیں۔خصوصی طور پر انہوں نے کلیم الدین احمد کے مدلل اور بے لاگ انداز تنقید اور صحت مند سخت گیری کی تعریف کی ہے۔

اس کتاب کے پہلے خطبے میں کلیم الدین احمد نے ادبی تنقید کے بنیادی نکات کی وضاحت کی ہے۔وہ ادبی تنقید کے دائرہ کار کا تعین کرتے ہوئے پہلی حد شاعری کی ماہیت،غرض وغایت اور اہمیت بتاتے ہیں،جب کہ دوسری حد اس کے حسن، اسلوب اور طریقۂ پیشکش کو قرار دیتے ہیں۔ظاہر ہے پہلا دائرہ نظریاتی تنقید کا احاطہ کرتا ہے اور دوسرا عملی تنقید کا اور بہت سی چیزیں ان دائروں کو جوڑتی ہیں۔اپنے پہلے خطبے میں انہوں نے اس کے پہلے دائرے؛یعنی ادب کے اصول اور نظریاتی باتوں تک خود کو محدود رکھا

ہے، جب کہ دوسرے خطبے میں وہ فن پارے کی قدر و قیمت کے تعین؛ یعنی عملی تنقید کو موضوع بناتے ہیں۔ شاعری میں پیشکش کی تکنیک کو وہ چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: نقوش، الفاظ، آہنگ اور لب ولہجہ اور کہتے ہیں کہ چوں کہ شاعری میں تجربہ کا بیان براہ راست نہیں ہوتا ہے؛ اس لیے ان نقوش کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کی شخصیت، جذبہ، لفظ، معنی اور وزن وغیرہ پر بھی مثالوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور ان تمام عناصر کے مطالعے کو عملی تنقید کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔

۸۔ اقبال: ایک مطالعہ

''اقبال: ایک مطالعہ'' تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل کلیم الدین احمد کی ایک مفصل کتاب ہے، جس میں دانتے اور اقبال، اقبال کی پانچ نظمیں، اقبال کی فارسی نظمیں، اقبال کی اردو اور فارسی غزل، اقبال کی آٹھ مختصر نظمیں، شاہین اور دی ونڈ ہوور اور اقبال اور ملٹن کے عنوانات سے سات مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال، کلیم الدین احمد کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان پر انہوں نے اردو شاعری پر ایک نظر اور دوسرے مضامین میں بھی اچھا خاصا لکھا ہے؛ مگر وہ دنیا کے عظیم شعرا کی صف میں انہیں جگہ دینے کو تیار نہیں۔ اقبال پر کلیم الدین احمد کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ شاعری کو چھوڑ کر پیغامبری کرنے لگتے ہیں۔ اس پیغمبری نے ان کی شاعری پر ضرب کاری لگائی ہے۔ بقول ان کے ''نرا پروپیگنڈہ، یا پیغام شاعری نہیں''۔ ''خضر راہ'' پر ان کا اعتراض ہے کہ اس کے اشعار میں آپس میں کوئی ربط نہیں ہے۔ اقبال کے فلسفے کا ان کی شاعری پر غالب آجانا بھی انہیں پسند نہیں۔ ''طلوع اسلام'' سے یہ شکایت ہے کہ شروع سے آخر تک خطیبانہ لہجے کی نمائندگی کرتی ہے۔ ''ذوق وشوق''، ''مسجد قرطبہ'' بھی ان کی نگاہ میں نامکمل، ہنگامی اور مخصوص نظریات کی تشہیر پر مبنی ہیں۔ ان میں شاعری کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ ہاں ''ساقی نامہ'' کو وہ پسند کرتے ہیں کہ اس میں خیالات نئے ہیں، رنگ بھی انفرادی ہے اور شعریت کو بھی پس پشت نہیں ڈالا گیا ہے۔ ان پانچ نظموں کے مطالعے کے بعد انہوں نے اقبال کی مختصر نظموں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ ان کی نظر میں ''شعاع امید'' اور ''لالہ صحرائی'' میں شعریت، ربط وتسلسل اور منظر نگاری کی خوبیاں ہیں؛ مگر بقیہ نظمیں مثلاً ''ایک آرزو''، ''ستارہ''، ''علم وعشق''، ''فرمان خدا'' وغیرہ انہیں خامیوں کا شکار ہیں، جن کا ذکر طویل نظموں کے سلسلے میں کیا گیا۔ مختصر یہ کہ ''اقبال ایک مطالعہ'' میں کلیم الدین احمد نے اقبال کی تعریف میں مبالغہ آمیز تعریفیں نہیں کی

ہیں؛ بلکہ اپنے طے کردہ اصول نقد کی روشنی میں ان کی شاعری کا محاسبہ کیا ہے۔ ان کے تجزیوں اور نتائج سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے؛ مگر ان کی افادیت اور غور وفکر کی دعوت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔

۹۔ قدیم مغربی تنقید

''قدیم مغربی تنقید'' بھی کلیم الدین احمد کے خطبات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے اتر پردیش اردو اکادمی میں ''توسیعی خطبات'' کی شکل میں دیئے تھے۔ اکادمی نے قدیم مغربی تنقید پر دیئے گئے ان تمام خطبات کو ۱۹۸۳ء میں کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اس میں کلیم الدین احمد نے قدیم مغربی ناقدین افلاطون، ارسطو، ہورلیس اور لانجائنس کے تنقیدی افکار ونظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی ۲۰۰۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۰۔ میر انیس

پروفیسر کلیم الدین احمد کے بیباکانہ اور جارحانہ اسلوب تنقید کی ایک مثال ان کی کتاب ''میر انیس'' بھی ہے، جس میں انہوں نے میر انیس کی مرثیہ نگاری کو مذہبیت اور عقیدت سے پرے ادب کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اردو ادیبوں سے شکوہ کیا ہے کہ ان کی عقیدت اور مبالغے نے انیس کی خامیوں سے چشم پوشی کی اور ادبی اعتبار سے محض موضوع کی بنا پر مرثیہ کو اعلیٰ ٹھہراتے رہے۔ وہ کہتے ہیں ''میر انیس اچھے خطیب ہیں اچھے شاعر نہیں''۔ وہ انیس کے یہاں بین، رخصت وغیرہ میں بے اعتدالی اور مبالغہ آمیزی کی بھی گرفت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: مبالغہ شاعری میں ممنوع نہیں؛ مگر جب یہی حد سے تجاوز کر جائے تو بدنما داغ بن جاتا ہے۔ انیس کے کلام میں بھی اسی قسم کی زیادتی موجود ہے۔

انیس کے مرثیوں میں واقعاتی انحراف، کرداری غلطیوں اور کربلا کی جغرافیائی خصوصیتوں سے ناواقفیت کی طرف بھی انہوں نے توجہ دلائی ہے۔ انیس کی سراپا نگاری پر بھی وہ سوال اٹھاتے ہیں اور انیس کے فن اور فطرت دونوں میں کجی یا شعوری گرہ کا شبہ قائم کرتے ہیں۔ اس طرح پوری کتاب میں انہوں نے انیس کے محاسن کم، معائب زیادہ دکھائے ہیں، چناں چہ اس کتاب میں کلیم الدین احمد کے پیش کردہ نتائج اور ان کے جارحانہ انداز نقد سے کئی بڑے ناقدین نے اختلاف کیا ہے؛ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کتاب انیس کی شاعری پر نئی اور غیر جانبدارانہ تنقید کی بہترین مثال ہے اور بلاشبہ انیسیات میں ایک اہم اضافہ کہی جا سکتی ہے۔

کلیم الدین احمد کی تحقیقی خدمات

اردو میں کلیم الدین احمد کو بحیثیت ناقد جو شہرت ملی، اس نے ان کی دیگر تصنیفات اور ادبی کاوشوں کو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ انہوں نے شاعری بھی کی، خودنوشت بھی لکھی اور تحقیق کے گل بوٹے بھی کھلائے؛ مگر حقیقت یہی ہے کہ ان کے دیگر کارنامے ادبی اور تاریخی کتب میں بھی کم کم موضوع گفتگو بنے۔ کلیم الدین احمد اور دیگر ناقدین نے بھی تنقید اور تحقیق کے مابین رشتے کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ تنقید بغیر تحقیق کے اور تحقیق بغیر تنقیدی شعور کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ تنقید و تحقیق کے اصول وضوابط الگ ہیں اور وہ ناقد و محقق سے الگ الگ اوصاف و خصائص کا تقاضہ کرتے ہیں۔ محقق کے لیے محنتی، عمق نگاہ اور اچھی یادداشت کا مالک ہونا ضروری ہے تو ناقد کا ادبی ذوق، تخلیقی صلاحیت اور تخیل بلند ہونا چاہیے۔ کلیم الدین احمد کے یہاں جہاں تنقید کی ساری صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں، وہیں تحقیقی اوصاف اور ہنرمندیوں سے بھی پوری طرح نوازے گئے تھے، چنانچہ انہوں نے نہ صرف یونیورسٹی میں اعلیٰ اور معیاری تحقیق کو فروغ دیا؛ بلکہ تذکرۂ شورش، تذکرۂ عشق، تذکرۂ گلزار ابراہیم، کلیات شاد، دیوان جوشش اور تین تحقیقی مقالات وغیرہ سے عمدہ تحقیق کا ایک معیار بھی قائم کیا۔ آئیے ہم ان کے چند تحقیقی کارناموں سے واقفیت حاصل کریں۔

۱۔ دو تذکرے

کلیم الدین احمد کی اس تحقیقی کاوش میں تذکرۂ شورش از میر غلام حسین شورش اور تذکرۂ عشق از

شیخ محمد وجیہ الدین عشق کے مندرجات کو آمنے سامنے پیش کیا گیا ہے؛ تاکہ دونوں شاعروں کے تذکرے بیک وقت نگاہوں کے سامنے رہیں اور پڑھنے والے مماثلت اور فرق خود دیکھ لیں۔ ''تذکرۂ شورش'' کی تکمیل ۱۱۹۳ھ میں ہوئی تھی اور ''تذکرۂ عشق'' کی ۱۲۳۰ھ میں۔ دونوں تذکروں کے زمانۂ تالیف میں تقریباً پچیس سال کا فاصلہ ہے؛ اس لیے طرز نگارش، بیان اور طریقہ پیش کش میں فرق پیدا ہونا فطری ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس فرق کی وضاحت نہیں کی ہے؛ بلکہ دونوں کی تصویریں پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے؛ اس لیے دو ''تذکرے'' کو تحقیق کا بہت اعلیٰ نمونہ تو نہیں کہا جا سکتا؛ مگر کلیم الدین احمد کے انفرادی طرز فکر اور تحقیقی دلچسپی کا ثبوت ضرور فراہم کرتا ہے۔

۲۔ تذکرہ دیوانِ جہاں

''تذکرہ دیوان جہاں'' کا ہندوستان میں واحد نسخہ Royal Asiatic Society Calcutta میں تھا۔ اس کی رسائی لوگوں تک بہ آسانی کرنے کے لیے کلیم الدین احمد نے شعبۂ انگریزی، پٹنہ یونیورسٹی سے نکلنے والے رسالے ''Current Studies'' میں ایک خصوصی ایڈیشن کے ذریعہ نقل بصورت اصل شائع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اصل متن لوگوں تک بہ آسانی پہنچ جائے۔ اس تذکرے کی تاریخ تکمیل کریم الدین نے ''طبقات الشعرا'' میں ۱۸۱۴ء بتائی تھی، جو غلط ہے۔ تذکرے کے آخری صفحے میں صحیح تاریخ ۱۸۱۲ء درج ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس صفحے کی عکسی تصویر شائع کر دی اور مقدمے میں کریم الدین احمد کا قول بھی نقل کر دیا۔ اس تذکرے کی اشاعت میں بھی کلیم الدین احمد تدوین و تحقیق کا کوئی نیا معیار نہیں پیش کرتے اور نہ ہی تحقیق کا کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ تذکرے کو عام لوگوں تک پہنچا دینا ہی وہ کام ہے، جس کی تعریف کی جا سکتی ہے۔

۳۔ تذکرہ گلزار ابراہیم

''تذکرہ گلزار ابراہیم'' نواب ابراہیم خاں خلیل کا تصنیف کردہ ہے جو ۱۱۹۸ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کی زبان فارسی ہے اور اس میں اردو شاعروں کے منتخب اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ ۳۲۰ رشعرا کا اندراج بہ اعتبار حروف تہجی کیا گیا ہے، جن میں معروف، غیر معروف اور نومشق شعرا بھی شامل ہیں۔ اس تذکرے میں کلیم الدین احمد نے کافی محنت کی ہے۔ پورے تذکرے کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا۔ دو قلمی نسخوں اور گلشن ہند سے موازنہ کر کے اس کا متن درست کیا، پھر ایک تفصیلی

مقدمہ کے ساتھ ''معاصر'' کے دو خصوصی شماروں میں شائع کیا۔اس لحاظ سے اس تذکرے کی تدوین واشاعت کو کلیم الدین احمد کا بڑا تحقیقی کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۴۔تاریخ نور

''تاریخ نور'' اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کے ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے اپنی محبوبہ نواب نور زماں بیگم کے نام لکھے تھے۔اس میں ۲۸ خطوط شامل ہیں، جن میں سے ۲۶ نظر بندی کے دوران اور ۲ رہائی کے بعد لکھے گئے ہیں۔ کتابی صورت میں یہ خطوط ۱۹۷۳ء میں آئے؛ مگر اس سے قبل ان کی اشاعت ''معاصر'' کے ۴۴ ویں شمارے میں ہو چکی تھی۔اس کے شروع میں کلیم الدین احمد کا ایک تفصیلی مقدمہ بھی ہے، جس میں نواب واجد علی شاہ کے تاریخی خد وخال واضح کئے گئے ہیں۔ یہ مقدمہ نواب واجد علی شاہ کے متعلق ان تمام غلط فہمیوں اور رائج غلط بیانوں کو رد کرتا ہے، جن کی وجہ سے نواب کی شخصیت ایک عیاش اور لچر شخص کے طور پر مشہور ہوگئی تھی۔انہوں نے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ نواب کسی قسم کے قرض دار نہ تھے اور نہ ہی شراب و کباب کے رسیا تھے۔وہ بہت مذہبی اور نماز کے پابند تھے، نیز رعایا کی تکلیفوں اور شکایتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔گویا ان خطوط کے ذریعہ نواب واجد علی شاہ کی ذاتی زندگی کی بہت اہم معلومات حاصل ہوجاتی ہیں اور نواب کی ایک نئی تصویر سامنے آتی ہے۔''تاریخ نور'' کے ذریعہ کلیم الدین احمد نے نواب واجد علی شاہ کے متعلق ذاتی، سیاسی اور تاریخی حقائق کو پیش کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

۵۔کلیات شاد

''کلیات شادؔ'' کی تین جلدیں جو بہار اردو اکادمی سے شائع ہوئیں، کلیم الدین احمد کی تحقیقی کاوش کا عمدہ نمونہ ہیں۔ان تین ضخیم جلدوں کو ترتیب دینے کے لیے انہوں نے ۳۵ ماخذات سے استفادہ کیا؛ مگر بنیاد ان نسخوں کو بنایا، جو شادؔ نے خود تیار کئے تھے، یا پھر ان کے احباب واقربا نے۔ ان نسخوں کی تعداد سات ہے۔

''کلیات شادؔ''، حصہ اوّل ۵۶۳ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں شادؔ کی ۳۱۱ غزلیں ہیں۔اسی جلد میں شاد کے حالات زندگی، کلیات شاد کے ماخذ، شاد اور اپنچ، اصلاحات شاد، شاد کی شخصیت اور شاد کی غزل گوئی کے عنوانات سے تفصیلات اور معلومات پیش کی گئی ہیں۔علاوہ ازیں اس میں شاد کے

۱۰۲ تلامذہ کی فہرست، شادؔ کا لکھا ہوا فارسی دیباچہ اور غزل اور غزلیات شاد کے عنوان کے تحت دو مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں۔''کلیات شادؔ''، جلد دوم ۵۴۶ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۴۷۶ غزلیں، قطعات اور ۲۳۹ رباعیات ہیں۔اس جلد میں ۲ ضمیمے بھی ہیں۔ پہلے ضمیمے میں فصاحت، تنافر، بلاغت، رعایت لفظی وغیرہ جیسے متعدد صنائع اور اصطلاحات کے متعلق وضاحتیں ہیں، جب کہ دوسرے ضمیمے میں ''ڈاکونامہ'' عنوان کے تحت شاد عظیم آبادی کی آخری تحریر پیش کی گئی ہے، جس میں وہ قیس رضوی کے متعلق اپنی شکایتوں اور ادبی ڈاکوں کا ذکر کرتے ہیں۔اسی حصے میں قاضی عبدالودود اور کلام شادؔ کے عنوان سے قاضی عبدالودود کے وہ جوابات شامل ہیں، جو کلیم الدین احمد کی فرمائش پر انہوں نے شادؔ کے اعتراضات پر دیئے تھے۔۷۴۱ صفحات پر مشتمل ''کلیات شادؔ''، جلد سوم میں شادؔ کی ۱۲۰ مثنویاں، نظمیں اور قطعات ہیں۔اس جلد میں نہ مقدمہ ہے، نہ مقالات۔''کلیات شادؔ'' کی ترتیب وتدوین میں کلیم الدین احمد نے غایت تحقیقی محنت اور لگن کا ثبوت پیش کیا ہے؛ اس لیے کلیم الدین احمد کا یہ ایک ناقابل فراموش تحقیقی کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۶۔دیوانِ جوشش

روشن علی جوشش عظیم آبادی کا دیوان ''دیوان جوشش'' کے عنوان سے ۱۹۴۱ء میں قاضی عبدالودود کے ذریعہ شائع ہو چکا تھا مگر انہوں نے صرف ایک نسخے سے کام لیا تھا۔کلیم الدین احمد کو بتیا راج کے کتب خانے سے اس کا ایک دوسرا نسخہ بھی ملا۔ان دونوں نسخوں کی مدد سے انہوں نے دیوان کی تصحیح کر کے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔اس دیوان کا سب سے اہم حصہ وہ مقدمہ ہے، جو انہوں نے دیوان کے شروع میں لکھا ہے۔کلیم الدین احمد نے مختلف تذکروں کی مدد سے جوشش کے حالات زندگی، جوشش کے تلامذہ اور جوشش کی شاعری کے متعلق بیش قیمت اور اہم معلومات پیش کی ہیں۔ نیز جوشش کی شاعری میں اساتذہ سے استفادہ، موضوعات کی عمومیت اور جوشش کی شاعرانہ قدر و قیمت پر بھی اپنی تنقیدی رائے پیش کی ہے۔اس طرح ''دیوان جوشش''، کلیم الدین احمد کی تحقیقی اور تنقیدی دونوں خوبیوں کا اظہاریہ ہے۔

۷۔تذکروں کی جنگ

''تذکروں کی جنگ''، کلیم الدین احمد کا تحقیقی مقالہ ہے، جو ''شب خون'' میں شائع ہوا تھا۔

اس میں میرؔ کے ''نکات الشعرا'' سے لے کر بعد میں لکھے گئے جواب الجواب تذکروں کو نشانہ بناتے ہوئے تذکرہ نگاروں کی انسانی غلطیوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔انہوں نے میرؔ پر سخت تنقید کی ہے، جنہوں نے اپنے عہد کے بڑے بڑے شعرا کی نکتہ چینی اور تنقیص کی ہے۔فتح علی حسینی گردیزی نے میر کا جواب دیا تو میرؔ کے مرتبے کو کم تر کرنے کی کوشش کی۔کلیم الدین احمد نے اس طرح کے مختلف تذکروں سے مثالوں کے ذریعہ تذکرہ نگاروں کی معاصرانہ چشمک،انسانی کمزوریوں اور غلط بیانیوں کا بڑی عمق نگاہی سے محاکمہ کیا ہے۔

۸۔شاعروں کی نوک جھونک

یہ کلیم الدین احمد کا دوسرا مقالہ ہے، جو ''معاصر'' کے ۲۵ویں اور ۲۶ویں شمارے میں قسط وار شائع ہوا تھا۔۱۹۴صفحات پر مشتمل اس مقالے میں ولی دکنی کے بعد سے لے کر انیس و دبیر کے عہد تک مختلف شاعروں کے درمیان ہونے والی معاصرانہ چشمکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔تذکروں سے دلچسپی نے غالباً کلیم الدین احمد کو اس موضوع کی جانب متوجہ کیا؛مگر تذکروں کی طرح ہی ان معاصرانہ چشمکوں میں بھی انہیں کوئی تنقید،یا ادبی کارنامہ جیسی چیز نہیں ملتی؛اس لیے مایوس ہوتے ہیں اور شاید اسی لیے چشمک کے بجائے نوک جھونک جیسا معمولی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ انگریزی ادب میں جہاں اس طرح کی چشمکوں کا نتیجہ کوئی فنی کارنامہ ہوتا ہے،یا کوئی گہری تنقید،اردو میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی؛مگر کلیم الدین احمد نے ادبی معرکوں کی تاریخ جس تسلسل اور تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے،وہ قابل تعریف ہے۔انہوں نے بڑی گہری نظر سے تذکروں کی چھان بین کی ہے اور ولی،نظیر،مظہر اور آبرو کی نوک جھونک کو مشکوک بتایا ہے؛مگر ضاحک اور سودا،مصحفی اور سودا،مصحفی اور انشا،غالب اور آغا جاں طیش،آتش و ناسخ وغیرہ کی مختصر،یا طویل چشمکوں کا انہوں نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ ہمارے سامنے ماضی کی جیتی جاگتی تصویریں کھڑی ہوجاتی ہیں،ان سے کوئی تنقیدی نکات تو نہیں حاصل ہوتے؛مگر شعرا کی شخصیت،مزاج، نفسیات اور ذہن کو سمجھنے میں ان سے معاونت حاصل ہوتی ہے۔

۹۔شاعر لوگ

۱۱۳صفحات پر مشتمل کلیم الدین احمد کا تیسرا مضمون ''شاعر لوگ'' (تذکروں کی روشنی میں)

کے عنوان سے ''معاصر'' کے ۲۷ویں شمارے میں شائع ہوا۔یہ مضمون بھی ماقبل دو مضامین کی طرح تذکروں کی روشنی میں شعرا کی شخصیت،مزاج،زندگی اور نفسیات کے مطالعے پر مبنی ہے۔فنی زندگی اور شخصی زندگی میں ربط ہو،یہ ضروری نہیں۔بڑے بڑے فنکار اپنی نجی زندگی میں ذہنی طور پر کج رو اور بد دماغ رہے ہیں۔کلیم الدین احمد نے فرائڈ،ایڈلر اور یونگ کے حوالے سے شعرا کی دوہری شخصیت اور مختلف برائیوں میں مبتلا ہونے کے اسباب بھی تلاش کئے ہیں۔خاص طور سے اس دور کی دو بڑی خرابیوں؛یعنی امرد پرستی اور ہوس پرستی کا مثالوں کے ساتھ ذکر کرکے انہوں نے متعدد شعرا کی شخصیت سے پردے اٹھائے ہیں۔اس کے علاوہ بادہ خواری،قتل وخون اور بوالہوسی جیسی برائیوں کے وجود کو بھی انہوں نے تذکروں سے مثالیں دے کر ثابت کیا ہے۔غرض کلیم الدین احمد کے تینوں مقالات کی بنیاد تذکرے ہیں۔ان کی نوعیت تحقیقی ہے،اگرچہ اس میں تنقید و ادب کے بجائے شعرا کی سماجی،نفسیاتی اور ذاتی زندگی کے مطالعے تک خود کو محدود کیا گیا ہے اور ایسے حقائق سے قارئین کو روبرو کرایا گیا ہے،جو خالص ادبی یا تنقیدی مطالعے کے تحت سامنے نہیں آسکتے تھے۔

خلاصہ کلام یہ کہ نقاد کی طرح بحیثیت محقق بھی کلیم الدین احمد انفرادیت قائم کرتے ہیں۔ انہوں نے کئی گمنام اور نایاب نسخوں کی ترتیب و تدوین کرکے اسے شائع کیا۔انہوں نے نسخوں کی تصحیح اور اشاعت میں جس ریاضت،محنت اور ایمانداری کا ثبوت دیا ہے،وہ ان کی تحقیقی اصولوں سے واقفیت کا بین ثبوت ہے۔تذکروں کے حوالے سے ان کے مضامین بھی تحقیقی اعتبار سے اردو ادب میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۰۔مقالات قاضی عبدالودود

یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں بہار اردو اکادمی پٹنہ سے شایع ہوئی،جس میں کلیم الدین احمد نے قاضی عبدالودود کے تین مقالات جمع کئے ہیں۔۲۵۱صفحات پر مشتمل اس کتاب میں قاضی عبدالودود کے تین مقالات کے علاوہ ۲۶صفحات پر محیط قاضی عبدالودود کی تحریر کردہ ایک خودنوشت ہے اور کلیم الدین احمد کے دو مضامین ''ایک لسانی محقق'' اور ''کچھ اس جلد کے بارے میں'' عنوانات سے ہیں۔''میں کون ہوں میں کیا ہوں'' ''معاصر'' کی فرمائش پر لکھا گیا مضمون ہے،جو ''معاصر'' قاضی عبدالودود نمبر میں شائع ہوا تھا اور جسے جوابات کی شکل میں قاضی صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔قاضی

صاحب کے حالات زندگی سے واقفیت کے لیے یہ تحریر بہت کارآمد ہے۔کلیم الدین احمد نے اپنے مضمون ''مثالی محقق''میں قاضی صاحب سے اپنے ذاتی تعلقات کے علاوہ قاضی صاحب کے مزاج،ان کے معیار تحقیق،مطالعہ پسندی،آزادروی،حسن اخلاق اور خدمات پر مختصراً روشنی ڈالی ہے،جب کہ مضمون ''اس جلد کے بارے میں''میں انہوں نے شامل کتاب قاضی صاحب کے تینوں تبصروں کا تعارف پیش کیا ہے۔قاضی صاحب کے جو تین تبصرے انہوں نے منتخب کئے ہیں،ان میں پہلا اور طویل تبصرہ ڈاکٹر اختر اورینوی کے تحقیقی مقالہ ''بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا: ۱۸۵۷ء تک''پر ہے،جو قسط وار''نوائے ادب''،بمبئی میں اکتوبر ۱۹۵۸ء سے اکتوبر ۱۹۵۹ء تک شائع ہوا تھا۔دوسرا تبصرہ ڈاکٹر سید محمد حسنین کے تحقیقی مقالہ پر ہے،جس کا عنوان ہے''مرزا محمد علی فدوی: ان کا عصر،حیات،شاعری اور کلام''۔ یہ ماہنامہ''صنم''،بہار نمبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ تیسرا تبصرہ ڈاکٹر ممتاز احمد کی ''مثنویات راسخ'' پر ہے،جو ہفتہ وار''ہماری زبان''،علی گڑھ (۸؍نومبر ۱۹۵۸ء،تا یکم جنوری ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوا تھا۔

اس کتاب کی ترتیب اور پیش کش میں کلیم الدین احمد نے جس محنت اور سلیقے کا اظہار کیا ہے،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترتیب کا کام بھی آسان نہیں۔اسے تحقیق کی طرح ہی سنجیدگی اور توجہ سے کرنی چاہیے۔

❋

کلیم الدین احمد کی شاعری

میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ کلیم الدین احمد کے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ان کے والد عظیم الدین احمد ذی علم شخصیت کے علاوہ شاعر بھی تھے۔بڑے ابا فہیم الدین احمد بھی شاعر تھے۔ان کا کلام''ولولے'' کے نام سے شائع ہوا۔عظیم الدین صاحب کے والد شاہ واعظ الدین بھی خاصے ذی علم تھے۔کلیم الدین احمد کی دادی کے والد حکیم عبدالمجید پریشاں اردو اور فارسی کے اہم شاعر تسلیم کئے گئے ہیں۔اس ادبی خاندان اور پس منظر کی وجہ سے کلیم الدین احمد کو بچپن سے ہی شعر وادب سے لگاؤ تھا۔انہوں نے خود ذکر کیا ہے کہ طالب علمی کے زمانے سے ان کی یہ عادت تھی کہ کوئی نظم،یا غزل پسند آتی تو اسے نقل کر لیتے۔ان نقلوں کو جمع کر کے انہوں نے دو کاپیاں بنائیں: پہلی کا عنوان تھا''کشکول''اور دوسری کا ''سبد گل چیں''۔کشکول میں ۲۳۰ غزلیں اور سبد گل چیں میں ۱۲۵ نظمیں تھیں۔ان اشعار نے ان کی زندگی کو نئے تجربات کے ذریعہ وسعت دی۔اپنی خودنوشت میں اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان شعروں میں مجھے گویا Substitute Living مل گئی تھی''۔

گھر میں ادبی ماحول تھا۔والد، بڑے ابا، والد کے نانا، بڑے بھائی مالو، والد اور بڑے ابا کے دوستوں میں اکثر شاعری کرتے تھے۔اس فضا کے اثر سے کلیم الدین احمد اسکول کے دنوں سے ہی شعر بھی کہنے لگے تھے۔صرف اردو ہی نہیں فارسی میں بھی شعر کہے۔

پروفیسر صدرالدین فضا شمسی نے اس دور کی شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ:

''کلیم صاحب کی شاعری کی ابتدا بھی غزل ہی سے ہوئی، جن دنوں یہ اسکول کے طالب علم تھے، ایک غزل، پہلی غزل لکھ کر اپنے ایک عزیز کو دی۔ وہ غزل مشاعرہ میں پڑھی گئی اور بہت مقبول ہوئی۔ ان کی ہمت بڑھی اور اب غزلیں کہہ کر دوسروں کو دینے لگے۔ ولایت جانے سے پہلے تک انہوں نے کافی تعداد میں غزلیں کہہ ڈالیں؛ مگر اپنے پاس کبھی نہ رکھا، سب لوگوں میں تقسیم کر دی''۔

(''۴۲ نظمیں: ایک روایت ایک بغاوت''، ص:۳۰۲)

مثال کے طور پر اس دور کے چند اشعار دیکھئے:

چلے آئے ہیں پیہم تیر ان کے میرے پہلو میں
مری خاموشیوں سے وہ مجھے غافل سمجھتے ہیں
راز عاشقی سے ہاں! دل کو آشنا کر لے
چھوڑ اس خودی کو چھوڑ اور اٹھ خدا ہو جا
عجلت عشق میں مضمر ہے ترے دل کی شکست
ذوق ہنگامۂ عریاں کو ذرا تھام ابھی

ان کے ابتدائی کلام زیادہ نہیں ملتے؛ اس لیے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ بعد میں جب ان کی شناخت بحیثیت ناقد مستحکم ہو گئی تو انہوں نے اپنی نظموں کے دو مجموعے قارئین کے سامنے پیش کئے ۴۲ نظمیں اور ۲۵ نظمیں۔ کلیم الدین احمد غزل کہہ کر غزل گوئی پر قدرت کا اظہار کر چکے تھے۔ وہ چاہتے تو غزلوں کا مجموعہ بھی پیش کر سکتے تھے؛ لیکن وہ شاعری میں جدت پیدا کرنا چاہتے تھے اور اردو کو نئے طرز کی نظمیں دینا چاہتے تھے؛ اس لیے انہوں نے نظمیں لکھیں اور کسی نظم کا عنوان مقرر نہیں کیا۔

مجموعہ ''۴۲ نظمیں'' کی اشاعت ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہوئی، جس میں ان کی ابتدائی نظمیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں کسی خاص موقع پر جذباتی ردعمل کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً پہلی نظم زمانۂ لندن کی یادگار ہے، جو ملک اور رفیقۂ حیات سے فراق کے جذبات بیان کرتی ہے۔ دوسری نظم پردیس میں عید کے موقع پر دلی احساسات و کیفیات کو پیش کرتی ہے۔ تیسری نظم رفیقۂ حیات حسنی بیگم کی وفات پر

شوہر کے قلبی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ بقیہ ساری نظمیں مختلف افکار، جذبات، خیالات کی عکاس ہیں۔ ان میں قلبی واردات بھی ہیں اور سماجی نظریات بھی۔ مشرقی اندازِ فکر بھی ہے اور مغربی اسلوب اظہار بھی۔ بطور نمونہ اس مجموعے سے ایک نظم کا ٹکڑا ملاحظہ کیجئے، جو منظری شاعری کا نمونہ بھی ہے:

دریا کی مست لہریں، سوئی ہوئی کہیں تھیں
دست صبا نے کیا کیا آ آ کے گدگدایا
آنکھیں انہوں نے کھولیں کچھ ناز کچھ ادا سے
سکھ نیند سے وہ دیکھو انگڑائی لے کے اٹھیں
سورج افق سے ابھرا کرنوں کا جال لے کر
اور ظلمت فلک کو اس جال میں پھنسایا
آنکھوں میں بلبلوں کی قندیلیں جگمگائیں
موجوں کے بادلوں میں بجلی چمک کے اٹھی

(ص:۱۶۳)

۲۵ نظموں پر مشتمل کلیم الدین احمد کا دوسرا شعری مجموعہ اگست ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں نسبتاً طویل نظمیں ہیں۔ ایک نظم آغاز کے طور پر ہے، جو ۴۲ نظموں میں شامل نہیں ہے، ''مرے خیال کا کہسار کون دیکھے گا''۔ اس سے کلیم الدین احمد کے خیالات، تصورات اور افکار کی وضاحت ہوتی ہے اور اپنی شاعری پر تبصرے کے ساتھ دوسرے شعرا کے لیے دعوت فکر بھی ہے۔

اس مجموعے کی نظمیں بھی عنوان سے عاری ہیں۔ ۴۲ نظموں کے مقابلے میں اس مجموعے کی نظمیں ذاتی اور قلبی احوال سے زیادہ زندگی کے فلسفوں، عشق کے تصورات اور عالمی تغیرات کے احوال بیان کرتی ہیں۔

نمونہ کے طور پر اس مجموعے سے بھی ایک نظم کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

سنسار میں کوئی بھی نہ ملا
جو میری سنے جو جانِ حزیں
پر دامنِ رحمت پھیلائے
میں دھرتی پر تب لوٹ آیا

اور اپنے شکاری سے یہ کہا
یہ دل بھی میرا حاضر ہے
یہ جان بھی میری حاضر ہے
ہاں شوق سے تیر اندازی ہو
وہ تیر لگے جو کاری ہو

(ص:۳۵)

کلیم الدین کے دونوں شعری مجموعوں کی پہلی انفرادیت ان کی جدت طرازی ہے۔ یہ جدت طرازی فکری اور اسلوبی دونوں سطحوں پر نمایاں ہے۔ اوّل یہ کہ انہوں نے کوئی دیباچہ نہیں لکھا جوان کی شاعری کی تفہیم میں معاون ہوتا۔ دوم انہوں نے نظموں کا عنوان مقرر نہیں کیا کہ عنوان سے ہی مرکزی خیال کی جانب اشارہ ہو سکے۔ سوم عام طور پر دوسرے شعرا کے مصرعوں یا شعروں کو نظم کا حصہ بنالیا گیا اور وہ بھی ''واوین'' کے بغیر۔ چہارم یہ کہ انہوں نے مغربی شعرا مثلاً ورڈزورتھ، ہارڈن اور براؤننگ کی نظموں سے خوب خوب استفادہ کیا اور مضامین، علامات، الفاظ کی سطح پر نئے نئے نقش ابھارے۔ جدت طرازی کے ان تمام نکات پر پروفیسر صدرالدین فضا شمسی اور پروفیسر ممتاز احمد نے اپنی کتابوں میں خاصی تاویلات پیش کی ہیں۔ میں یہاں انہیں دہرانا نہیں چاہتا مگر یہ تسلیم ضرور کرنا ہوگا کہ ان امور سے کلیم الدین احمد کی شاعری میں ایک امتیاز اور انفرادیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ موضوعاتی سطح پر کلیم الدین احمد کی نظموں میں تنوع اور رنگارنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ کہیں واردات قلبی کا بیان ہے تو کہیں عالمی تغیرات کا۔ کہیں عشق کی شہوانیت اور بوالہوسی ہے تو کہیں حسن کی ابدیت۔ کہیں وصال کی تپش، دل کی بے قراری ہے تو کہیں فراق زدہ عاشق کی دیوانگی۔ تعریف سخن، دعوت فکر، شعرا کو تلقین اور فنون لطیفہ کی کرشمہ سازیاں موضوع سخن بنتی ہیں تو خیر وشر کے مابین تضاد، انسان کی مجبوری ومحکومی، ذات حق کی تلاش اور خدا کا ارتقاپذیر تصور بھی کلیم الدین احمد کے محبوب موضوعات کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

اسلوبی سطح پر کلیم الدین احمد کے یہاں جدت اور تجربے کا حصہ کم ہے۔ وہ روایتی اور علامتی دونوں قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی مقامی اور ہندی الفاظ وتراکیب برتنے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ اساطیری اور دیومالائی عناصر بھی ان کی نظموں کا حصہ بنتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر

پروفیسر صدرالدین فضا شمسی نے کہا ہے کہ ان کی نظموں میں ڈرامیٹک مونولاگ کا انداز ہے۔ نظموں میں عضویاتی تکمیل پر انہوں نے بہت زور دیا تھا؛ اس لیے کوشش کرتے ہیں کہ نظموں میں ارتقائی کیف کی بازآفرینی ہو۔

ان نظموں کی اشاعت کے بعد مختلف تبصرے شائع ہوئے۔ کسی نے کہا کہ یہ نظمیں ہمیں بالکل نئے انوکھے تجربات سے آشنا کراتی ہیں۔ کسی نے لکھا ان نظموں سے اردو میں مثالی نظموں کی بنیاد مستحکم ہوتی ہے۔ کسی نے فیصلہ سنایا یہ نظمیں مکمل نظمیں ہیں اور شاعرانہ تجربات کی غماز ہیں۔ کسی نے روایتی انداز کے شعری مجموعے قرار دیتے ہوئے نئی چنگاریوں کا حامل بھی بتایا؛ مگر ساتھ ہی اس کی سخت تنقید کرنے والوں کی بھی آرا سامنے آئیں، جنہوں نے ان نظموں کو مغلق، پیچیدہ قرار دیا اور انہیں زبردستی کا شاعر لکھا۔ کہیں شدت احساس کی کمی کا شکوہ کیا گیا تو کہیں شاعر کو خشک خیال قرار دیا گیا۔ غرض مختلف ناقدین نے ان کی تنقید کی طرح شاعری کو بھی اپنی اپنی نگاہوں سے دیکھا؛ مگر بالعموم یہ ضرور تسلیم کیا گیا کہ کلیم الدین احمد نے جو عناصر شاعری کے لیے ضروری قرار دیئے تھے، انہیں حتی الامکان اپنی نظموں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظمیں اردو شاعری کو راستہ دکھانے کی غرض سے کم، اردو شعرا کو عبرت اور ترغیب دینے کے جذبے کے تحت زیادہ لکھی گئیں۔ انہوں نے شاعری کی روح سے بغاوت نہیں کی اور نہ روایت کو فراموش کیا؛ مگر ان کا غزل مخالف رویہ یہاں بھی جاری رہا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نظمیں دلوں میں جگہ نہیں بنا پائیں اور پروفیسر صدرالدین فضا شمسی، پروفیسر ممتاز احمد، ڈاکٹر وارث الرحمٰن وغیرہ کی تشریحات اور مبالغہ آمیز توضیحات کے باوجود اردو کا قاری ۴۲؍نظموں اور ۲۵؍نظموں کی کسی نظم سے آج تک بھرپور استفادہ نہیں کر سکا۔

کلیم الدین احمد کی دیگر ادبی خدمات

گل نغمہ

''گل نغمہ''، کلیم الدین احمد کے والد پروفیسر عظیم الدین احمد کی نظموں کا مجموعہ ہے، جسے کلیم الدین احمد نے ترتیب دے کر ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے کا سب سے اہم حصہ اس کا مقدمہ ہے، جس میں کلیم الدین احمد نے شاعری کے متعلق نظریاتی گفتگو کی ہے اور اپنے والد کی نظموں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ ۲۶ صفحات پر مشتمل اس مقدمے میں ہی وہ مشہور جملہ ''غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے'' بھی ہے جو کلیم الدین احمد کی شہرت کا سبب بنا اور جس کے ردعمل کے طور پر ان کی تنقید کو نشانہ بنایا گیا۔

''گل نغمہ'' کو کلیم الدین احمد نے اس کے موضوعات اور تجربات کی بنا پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ رقص بسمل، صدائے خاموش اور نغمۂ جرس۔ تینوں حصوں میں کل ۳۶ نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں کو کلیم الدین احمد نے اردو شاعری میں ایک خوشگوار اضافہ قرار دیا ہے۔ اس خیال پر حیرت کا اظہار کیا گیا کہ جس ناقد کی نگاہ میں سودا، انیس اور اقبال جیسے شعرا کے کارنامے نامکمل محسوس ہوئے، اس نے کس طرح ایک عام سے شعری مجموعے کو اردو شاعری میں ایک باب کا اضافہ قرار دے دیا۔ اس کے باوجود اس مقدمے کو اہم کہا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ اس سے کلیم الدین احمد کے تنقیدی اور فکری شعور کا اندازہ ہوتا ہے اور اردو شاعری کے متعلق ان کے خیالات سامنے آتے ہیں۔

اپنی تلاش میں

''اپنی تلاش میں''، کلیم الدین احمد کی خودنوشت سوانح حیات ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے پیدائش، خاندانی احوال، سماجی وتہذیبی احوال اور اپنی زندگی کے سفر کو بہت تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔ کلیم الدین احمد ایک متنازعہ شخصیت کے مالک تھے؛ اس لیے ان کے خیالات، احوال زندگی اور نفسیات سے واقفیت کے خواہاں حضرات کی تعداد کم نہ تھی۔ یہ خودنوشت ایسے لوگوں کی تسکین کا باعث ہے؛ کیوں کہ عام طور پر اس خودنوشت کو لوگوں نے معتبر قرار دیا ہے۔ وہ ان تمام واقعات اور حادثات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں، جنہوں نے ان کی شخصیت، یا زندگی کو متاثر کیا، وہ اپنی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں اور اس کی صداقت کو جاننے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

''اپنی تلاش میں''، شخصیت نگاری کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ مصنف کی ابتدائی زندگی کا حال، ان کے تعلیمی مشاغل، کھیل کود میں دلچسپی اور گھر کی اندرونی سادہ زندگی؛ یعنی ہر وہ پہلو ہے، جو کسی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہوسکتی ہے۔ پسند ناپسند، کھانا کی قسمیں، ناپسندیدہ ڈشیز، پوشاک، انداز رہائش، ناپسندیدہ اشیا اور مزاج تک کی تفصیلات اس کتاب میں بیان کی گئی ہیں۔ اپنی آپ بیتی کے ساتھ دوسرے لوگوں مثلاً والد محترم، والدہ، بڑے ابا، مالو بھائی، منو بھائی، کمو بھائی، بلخی برادران، ہمسایوں، ہم جماعتوں، زمانہ لندن کے دوستوں، کالج کے ساتھیوں، پروفیسروں، ہم عصر شعرا وادبا کے ساتھ ساتھ گھر کے نوکروں تک کے واضح خاکے اس خودنوشت میں پیش کیے گئے ہیں، جن سے کلیم الدین احمد کی دنیا سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

کلیم الدین احمد نے اس خودنوشت میں اپنے عہد کے ادبی ماحول کی تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ عظیم آباد کے مشاعرے بڑے مقبول مشاعرے ہوتے تھے۔ ان مشاعروں کی نظم، ترتیب اور تہذیب کا اپنا ایک انداز تھا۔ کلیم الدین احمد نے ایسے کئی مشاعروں کے حالات درج کیے ہیں، جو بہار میں اردو شاعری کی تاریخ کا اہم حصہ ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ''دائرہ ادب'' کا قیام، ''گل نغمہ'' کی اشاعت، ''معاصر'' کا اجرا، قاضی عبدالودود، اختر اورینوی اور بہار کے دوسرے ادبا وشعرا کی سرگرمیاں وغیرہ بھی اس عہد کے ادبی مزاج کی عکاسی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کے علاوہ انہوں نے ان معاصرانہ چشمکوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو اس وقت

عظیم آباد کا حصہ تھیں۔ اس سلسلے میں خاص طور سے انہوں شاد عظیم آبادی کے مخالفین اور معترضین کا ذکر کیا ہے۔

''اپنی تلاش میں'' کلیم الدین احمد کی اپنی علمی، ادبی اور عملی زندگی کا بھی خوب صورت اظہار یہ ہے، جس میں اپنی تعلیم وتربیت اور ملازمت کے سلسلے میں انہوں نے ابتدائی تعلیم سے کیمبرج تک کے ہر مرحلے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ رفقا کے نام، اساتذہ کے نام، ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت، اساتذہ کا انداز تدریس، نصاب میں شامل چیزیں، کالج کے نوٹس، پٹنہ کالج میں دوران تعلیم پڑھی گئی چیزیں، کیمبرج میں پڑھی گئیں کتابیں، وہاں کی تعلیمی زندگی، کلاس میں ان کے اساتذہ کا رویہ اور لندن میں طلبا کی زندگی وغیرہ پر انہوں نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے، یہاں تک کہ ان کے کس نوٹس پر Excellent ملا، کن لڑکیوں سے ان کا سابقہ پڑا اور کن اساتذہ کی کتابوں نے ان کے دل ودماغ کو متاثر کیا وغیرہ کا بھی ذکر انہوں نے وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔

وہابی تحریک کا جائزہ بھی ان کی خودنوشت کا اہم حصہ ہے، جسے انہوں نے تین ابواب میں پھیلا دیا ہے۔ اس ذکر سے وہابی تحریک کی مکمل تاریخ، افکار ومقاصد، طریقہ جنگ، شکست کی وجوہات، اہل صادق پور کی خدمات اور ان کی ادبی کاوشیں تمام جزئیات کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔

یہ خودنوشت کلیم الدین احمد کے ادبی اور تنقیدی نظریات کی تفہیم میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس میں پیش کردہ اشعار (جو کثیر تعداد میں ہیں) سے ان کے ذوق شعری کا پتہ چلتا ہے اور اپنی نظموں کے تعلق سے دوسروں کے اعتراضات کا جو جواب وہ دیتے ہیں، ان سے ان کے تنقیدی انداز فکر کا احساس ہوجاتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی نظموں کی توضیحات پیش کرتے ہیں؛ بلکہ اپنی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کے اغراض ومقاصد اور ان کی قدر وقیمت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

''اپنی تلاش میں'' کی نثر سادہ وسلیس ہے۔ پہلی جلد میں ادبیت اور تخلیقیت کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ فلسفیانہ رنگ اور نفسیاتی دروں بینی کے عناصر بھی ملتے ہیں اور بیان میں معروضیت بھی خاصی ہے، جب کہ دوسری اور تیسری جلدوں میں واقعات کی تفصیلات پر زیادہ زور ہے۔ نثر میں ادبیت کے عناصر کم ملتے ہیں؛ مگر بیان میں واقعیت، سچائی اور خلوص کی وہ توانائی ہے، جو خودنوشت میں افسانوی دلچسپی پیدا کردیتی ہے۔ مختصر یہ کہ ''اپنی تلاش میں'' کلیم الدین احمد کی ذاتی، علمی، ادبی زندگی کے ساتھ

ساتھ ایک مخصوص عہد کی تہذیبی اور علمی فضا کی تفہیم میں دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

میری تنقید ایک باز دید

''میری تنقید ایک باز دید'' کے عنوان پر خدابخش لائبریری، پٹنہ میں کلیم الدین احمد نے ۱۹۸۷ء میں ایک خطبہ دیا تھا۔ اسی خطبے کو لائبریری نے کتابی شکل میں شائع کردیا جو محض ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ کلیم الدین احمد کے تنقیدی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں یہ کتاب بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس میں انہوں نے بہت اعتماد کے ساتھ یہ کہا ہے کہ غزل کے متعلق ان کے جو خیالات ابتدائی دنوں میں تھے ان میں آج بھی انہیں کسی ترمیم واضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس مختصر کتاب میں انہوں نے اپنی تنقید پر بعض اعتراضات کے جواب دیئے ہیں اور بعض غلط فہمیوں کی تردید بھی کی ہے۔ مگر سب سے اہم بات یہی ہے کہ اس کتاب سے کلیم الدین احمد کے تنقیدی خیالات کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے خیالات یا تنقیدی نظریات میں ارتقا، تبدیلی یا ترمیم کی کوئی گنجائش کم رہی ہے۔

Idols

کلیم الدین احمد کا ایک طویل مضمون لاہور سے نکلنے والے رسالے Oriental Literature میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو خدابخش لائبریری، پٹنہ نے ۲۰۰۵ء میں کتابی شکل میں شائع کیا اور اس کا اردو ترجمہ ''اصنام'' کے عنوان سے پاکستان میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کتاب کا تعلق براہ راست ادب سے تو نہیں؛ مگر کلیم الدین احمد کی شخصیت، خیالات اور تخلیقات کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ چالیس صفحات پر مشتمل یہ مختصر کتاب چھ ابواب میں منقسم ہے۔ انہوں نے اس میں کہا ہے کہ بت پرستی ماضی کا عمل نہیں ہے۔ یہ آج بھی موجود ہے، صرف بتوں کے چہرے بدل گئے ہیں۔ انسانی سماج نے مختلف قسم کے بت گڑھ لیے ہیں۔ مثلاً قوم، نسل، وطن، تہذیب وتمدن، سائنس، خاندان، خود پسندی، فکری غلامی، رشتے اور خواہشات وہ بت ہیں، جن کی پرستش میں انسان اپنے اصل خدا سے دور ہوگیا اور اس حد تک تنزل کا شکار ہوا ہے کہ مسلسل خوف میں جی رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں ان بتوں سے آزاد ہوکر صرف اللہ اور اللہ کے احکام کی پیروی ہی اسے سچی خوشی عطا کرسکتی ہے۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں کہ اسلام ایک آفاقی

مذہب ہے، اس کی تعلیمات ہماری تسکین کے لیے کافی ہیں؛ مگر ان ہیبت ناک بتوں نے ہمیں اسلامی تعلیمات سے دور کر دیا ہے۔ اسلام کی بجائے یہ بت ہی ہمارے مرکز ومحور بن گئے ہیں۔ خدا کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا غلامی نہیں، آزادی ہے۔ ایسی آزادی جو ہمیں بتوں کی تمام قیود سے آزاد کرتی ہے، روحانی خوشی عطا کرتی ہے اور ہماری پیدائشی اور فطری حدوں کو توڑتی ہے۔ بقول کلیم الدین احمد ان مصنوعی خداؤں کا گھر امریکہ ہے، جہاں ڈالر کی پوجا کی جاتی ہے۔ اشتراکیت کو بھی وہ ایک مصنوعی خدا قرار دیتے ہیں، جو دنیا میں مصنوعی جنت کی دعوت دے کر انسانوں کو ورغلاتا ہے؛ اس لیے یہ زیادہ خطرناک بت ہے۔ سائنس بھی اسی قسم کا ایک بت ہے، جو پیدا ہوا تھا فلاح انسانیت کے لیے، مگر بھٹک کر انسانیت اور خدا سے ہمیں دور کر رہا ہے۔ خود پسندی، خودغرضی اور لالچ جیسے بت دنیا میں تمام قسم کے فسادات کی جڑ ہیں، جب تک دنیا کے سارے انسان ان نئے بتوں اور مصنوعی خداؤں کی پرستش چھوڑ کر متحد نہیں ہو جاتے، ان کی فلاح نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اسلامی تعلیمات کی روشنی ساری دنیا تک پہنچ سکتی ہے۔

کلیم الدین احمد کی یہ مختصر کتاب اسلام، اسلامی تعلیمات اور قرآن پاک پر ان کے اٹوٹ یقین کا اظہار کرتی ہے اور اسلام کو فلاح انسانیت کا واحد ذریعۂ نجات قرار دیتی ہے۔

جامع انگریزی اردو لغت

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کی جانب سے دولسانی (انگریزی و اردو) لغت کا ایک پروجیکٹ پروفیسر کلیم الدین احمد کو دیا گیا تھا۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل انہوں نے بڑی جانفشانی اور محنت سے کی۔ نتیجہ کی شکل میں تقریباً ڈھائی لاکھ الفاظ پر مشتمل یہ گراں قدر لغت ۶ جلدوں میں سامنے آئی اور بے حد کارآمد ثابت ہوئی۔

اس لغت پروجیکٹ کے چیف ایڈیٹر کلیم الدین احمد تھے، جب کہ معاونین میں اردو فارسی کی معروف شخصیات عطا کاکوی، پروفیسر محمد صدیق، پروفیسر ممتاز احمد، سید عبدالحامد، محمد کمال الدین ہاشمی، مصطفیٰ کمال ہاشمی، رضوان احمد خاں، بشیر الدین احمد، ناصر رضا خاں اور کاظم حسین وغیرہ تھے۔ اس لغت کی پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں مکمل ہو گئی تھی اور بقیہ حصے بھی پانچ سال میں مکمل ہو گئے تھے؛ مگر ان کی اشاعت تقریباً ۲۰؍برسوں کے بعد عمل میں آسکی، جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

پہلی جلد	۱۲۱۷؍صفحات	۱۹۹۴ء
دوسری جلد	۱۰۴۸؍صفحات	۱۹۹۸ء
تیسری جلد	۱۰۹۱؍صفحات	۱۹۹۵ء
چوتھی جلد	۸۵۰؍صفحات	۱۹۹۷ء
پانچویں جلد	۱۰۴۲؍صفحات	۱۹۹۸ء
چھٹی جلد	۱۰۱۲؍صفحات	۱۹۹۸ء

اس لغت میں مختلف علوم سے متعلق اصطلاحات کو شامل کیا گیا ہے اور ہر لفظ کے ذیلی معنی اور ذیلی اندراجات بھی مختلف علوم کے لحاظ سے دیئے گئے ہیں۔ الفاظ کے لغوی معنی کے ساتھ اصطلاحی معنی بھی شامل ہیں۔ یہ لغت پروفیسر کلیم الدین احمد کی محنت، جانفشانی اور منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کی صلاحیت کی غماز ہے۔ مترجمین، اساتذہ وطلبا کے لیے کارآمد ہے۔ غالباً اس کی افادیت کا خیال رکھتے ہوئے موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے دوبارہ اس کی اشاعت کا پروگرام بنایا ہے۔

معاصر کے مضامین اور تبصرے

میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ پروفیسر کلیم الدین احمد نے اردو شاعری پر ایک نظر کی اشاعت کے بعد ”دائرہ ادب“ کی بنیاد ڈالی اور ”معاصر“ کا اجرا کیا۔ اس کی مجلس ادارت میں عظیم آباد کے مختلف دانشور اور اساتذہ شامل تھے؛ مگر زیادہ تر کام خود کلیم الدین احمد دیکھتے تھے۔ اس میں جہاں دوسرے اکابرین کے مضامین شائع ہوتے تھے، خود کلیم الدین احمد کی تحریریں بھی تواتر سے شائع ہوتیں۔ ان تحریروں پر اعتراضات اور جوابات کا سلسلہ بھی چلتا۔ کلیم الدین احمد کے کئی اہم مضامین اور مباحث ہمیں رسالہ ”معاصر“ میں بھی ملتے ہیں۔

”سخن ہائے گفتنی“ میں شائع مضمون ”ایک مغربی سیاح کے خطوط“ آل احمد سرور اور فراق گورکھپوری کے خطوط کے جواب میں ”معاصر“ جلد: ۳، نمبر: ۵ میں شائع ہوا، جس پر مصنف کا نام جون سمپل درج تھا۔ آل احمد سرور نے ”معاصر“ کے حصہ نظم میں شعریت کی کمی کی شکایت کی تھی اور فراق نے اردو شاعری پر کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ کلیم الدین احمد نے سوال

اٹھایا کہ شعریت کیا ہے؟ اور غزل کے مبالغہ آمیز تحفظ پہ طنز کیا۔ ''سخن ہائے گفتنی'' کی اشاعت سے پتہ چلا کہ جون سمپل دراصل کلیم الدین احمد ہی تھے۔ ''سخن ہائے گفتنی'' کے عنوان سے کلیم الدین احمد ''معاصر'' میں مسلسل ادبی مباحث قائم کر رہے تھے۔ ان کے بہت سارے اہم مضامین مثلاً شعریت کیا ہے؟ الفاظ اور شاعری، روایت اور اردو شاعری، اقبال کا نظریۂ فن، جوش کی ایک نظم، غالب بحیثیت نقاد، غزل و قطعہ، تنقید کیا ہے؟ تنقید کی بھول بھلیاں، شاعر لوگ، شاعروں کی نوک جھونک، جغرافیہ و جودِ چین، جغرافیہ و جودِ جاپان، اردو ادب میں طنز و ظرافت، ریڈیو کلچر، پڑھنے کا فن، انیس کے مرثیوں کا نظام اور عدم جواز گریہ، ناول کا فن، شاد کی غزل گوئی وغیرہ پہلے ''معاصر'' ہی میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف کتابوں اور تخلیقات پر تبصرے مثلاً کیفی کی مثنوی ''جگ بیتی''، عظمت اللہ خاں کی ''سریلے بول'' جاذب دہلوی کی ''باغی''، وقار کی ''آہنگ رزم''، فراق کی ''اردو کی عشقیہ شاعری'' اور آصف علی کی ''پرچھائیں اور اس کا دوسرا رخ'' پر تبصرے بھی ''معاصر'' کے مختلف شماروں کی زینت بنے۔

دیگر رسائل میں شائع شدہ مضامین

''معاصر'' کے علاوہ کلیم الدین احمد کی تحریریں دوسرے ادبی و علمی رسائل کی زینت بھی بنتی رہی ہیں۔ ان میں سے جو مضامین اب تک دستیاب ہو سکے ہیں، کلیم الدین احمد کی خدمات کے ذیل میں ان کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

رسالہ ''اردو'' میں کسی شخص نے ''گل نغمہ'' اور ''اردو شاعری پر ایک نظر'' پر ایک تبصرہ لکھا تھا، جو کلیم الدین احمد کی نگاہ میں بیان اور اظہار دونوں اعتبار سے غیر معیاری تھا۔ کلیم الدین احمد نے عبدالحق صاحب کے کہنے پر ایک مضمون ''تنقید، یا استہزا'' کے عنوان سے لکھا، جو رسالے میں عبدالحق صاحب کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

نیاز فتح پوری نے ''نگار'' کے ۳۹ ویں شمارے میں ''عہد حاضر کے تمام خوش فکر اساتذہ کا خود انتخاب کیا ہوا کلام'' شائع کیا، پھر اس انتخاب پر پانچ ناقدین سے تنقیدیں لکھوائیں۔ کلیم الدین احمد نے بھی ان کی فرمائش پر ایک مضمون ''بزم نگار'' کے عنوان سے لکھا، جو ''نگار'' کے جنوری، فروری ۱۹۴۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ مضمون ''سخن ہائے گفتنی'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

لاہور سے ایک رسالہ Oriental Literature نکلتا تھا۔ اس کے مدیر کی درخواست پر کلیم الدین احمد نے دو مضامین لکھے: پہلا Iqbal's Conception of Art اور دوسرا Idols۔ پہلے مضمون کا ترجمہ ''اقبال کا نظریۂ فن'' کے عنوان سے ''سخن ہائے گفتنی'' میں شامل ہے، جب کہ Idols کا ترجمہ پاکستان میں ہی ''اصنام'' کے نام سے شائع ہوا۔

ان مضامین کے علاوہ رسالہ ''شب خون'' الہ آباد میں ''تذکروں کی جنگ''، رسالہ ''اورنگ'' میں ''مسلمانوں کے تعلیمی مسائل''، ''اردو زبان اور اس کی مذہبی وتہذیبی اہمیت'' اور ''نظام تعلیم'' کے عنوان سے تین مضامین، ''مطالعہ'' پٹنہ میں ''غالب کا آرٹ'' اور ''زبان و ادب، پٹنہ'' میں ''شاد اور مرثیہ'' اور ''نظم کا ترجمہ مشکل ہے'' بھی شائع ہوئے۔

نمونۂ نثر

"جذبات ذاتی ہوں، یا فرضی، ان میں اگر جوش نہ ہوتو کامیاب شاعری ممکن نہیں؛ لیکن جوش ایسا نہ ہو کہ شاعر کے قابو سے باہر ہو جائے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ وہ طوفان جذبات وتصورات کو قابو میں رکھے۔ انہیں جانچے، پرکھے اور تلاطم کو سکون کی شکل میں پیش کرے۔ اندر کوہِ آتش فشاں شعلہ زن ہو؛ لیکن سطح پر اتنا سکون ہو کہ حسین پھول کھلے نظر آئیں"۔

("اردو شاعری پر ایک نظر"، حصہ اول ص:۲۶)

"غالب کوشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات وجذبات، یا ایک ہی خیال، ایک ہی جذبہ کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں۔ اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ تو کامیابی ممکن نہیں؛ لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں، جس سے مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہوسکتے؛ لیکن غالب ایک بات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کی طرف توجہ پڑتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان دوسری باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ گویا محشرستان خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازے کی کلید ہے"۔

("اردو شاعری پر ایک نظر"، ص:۱۸۸)

"تنقید کوئی کھیل نہیں ہے، جسے ہر شخص بہ آسانی کھیل سکے۔ یہ ایک فن ہے،

ایک صناعی ہے۔ فن تو ہر طرح کے ہوتے ہیں مشکل بھی اور آسان بھی۔ تنقید مشکل ترین فن ہے۔ ہر فن کی طرح اس کے بھی اصول وضوابط اور اغراض ومقاصد ہیں۔ ادب اور زندگی میں اس کی مخصوص اور قیمتی جگہ بھی ہے؛ اس لیے ہر کس وناکس ایک نقاد کے فرائض انجام نہیں دے سکتا"۔

("سخن ہائے گفتنی"، ص:۱۶)

"آرٹسٹ کے لیے کوئی مخصوص، صاف، متعین فلسفۂ زندگی پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔ وہ تو صرف اپنے ذاتی عمیق تجربات کا اظہار کرتا ہے۔ ایسے تجربات بیش بہا اور عدیم المثال ہوتے ہیں۔ وہ ایسی چیزوں کا بیان کرتا ہے، جنہیں وہ خاص لمحے میں دیکھتا ہے۔ ایسی چیزیں جو نایاب حسن رکھتی ہیں اور فوراً بدل جاتی ہیں۔ بہرکیف وہ کوئی فلسفہ زندگی بھی پیش کرسکتا ہے اور یہ فلسفہ مختلف طور پر اس کی مدد بھی کرسکتا ہے۔ یہ اس کے فنی کارناموں کو یگانگت اور موزونیت بخشتا ہے۔ انہیں ایک مکمل کل میں منسلک کرتا ہے اور اس کی انشا کو انفرادی اور پرزور بناتا ہے؛ لیکن کبھی یہی فلسفہ سد سکندر کی طرح راہ میں حائل بھی ہوجاتا ہے"۔

("سخن ہائے گفتنی"، ص:۷۸)

"سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک اردو تنقید تذکرے کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھتی، پرانے تذکرہ نگار سیدھے سادے طریقے سے نسبتاً خموشی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ آج کل زور وشور، ہنگامہ، طمطراق زیادہ ہے؛ لیکن اندر خلا ہی خلا ہے۔ ترتیب اور مناسبت کا لحاظ زیادہ ہے؛ لیکن تنقید اب بھی نہیں ملتی"۔

("اردو تنقید پر ایک نظر"، ص:۱۸)

"طلسم ہوش ربا معمولی کھانا نہیں، ایک عظیم الشان دعوت ہے۔ شاہانِ جہاں کے لائق۔ یہاں ہر چیز کی افراط ہے۔ کسی شئے کی کمی نہیں، پھر یہ دعوت چند خوش قسمت لوگوں کے لیے نہیں؛ بلکہ یہ دعوت، دعوت عام ہے"۔

("اردو زبان اور فن داستان گوئی")

"اب یہ کیسے کہوں کہ اقبالؔ دنیائے فنون کے قدیم اور جدید نمونوں سے

ناواقف تھے۔ واقف ضرور تھے۔ انہوں نے ایک نظریہ بنا رکھا تھا کہ وہی فنی کارنامے زندۂ جاوید ہیں، جنہیں مردِ خدا، مردِ مومن، یا مردِ حر نے بنایا ہے۔ وہ نقاشی میں ہوں، موسیقی میں ہوں، مصوری میں ہوں، یا شاعری میں ہوں۔ ممکن ہے آپ بھی اس نظریے سے متفق ہوں؛ کیوں کہ یہ بہت دل خوش کن نظریہ ہے اور احساس کمتری کو دور کرتا ہے؛ لیکن یہ حقیقت سے دور ہے''۔

(''اقبال: ایک مطالعہ''، ص:۱۴۹)

''میں اس بات پر اعتراض نہیں کر رہا ہوں کہ انیسؔ Super Naturals کا استعمال کر رہے ہیں۔ اس کا انہیں حق تھا اور جو مذہبی پیٹرن اس معرکۂ کربلا کا پس منظر ہے، وہ انہیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ مافوق الفطرت عناصر سے کام لیں۔ اعتراض اس پر ہے کہ وہ اس کو گھر کی مرغی کی طرح اس افراط سے غیر ضروری طرح، نہ فن کا تقاضہ ہے، نہ مذہب کا تقاضا ہے، نہ قصہ کا تقاضا ہے، استعمال کرتے ہیں کہ یہ دال برابر ہو جاتے ہیں''۔

(''میر انیس''، ص:۳۰)

''اردو میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عام خیالات کا ذخیرہ ہے، جس میں سے ہر شاعر حسب ضرورت خیالات چن لیتا ہے؛ یعنی اس حقیقت کو بھلا دیا گیا ہے کہ ہر شعر میں ایک انفرادی تجربہ ہوتا ہے؛ بلکہ ہر شعر ایک انفرادی تجربہ ہے۔------ یہ تو جانی ہوئی بات ہے کہ زیادہ سے زیادہ شعروں میں چند بندھے ٹکے مضامین، پیش پا افتادہ خیالات، کم سے کم ایسے عام تصورات ہیں، جو کسی خاص شاعری کی جاگیری نہیں، ان پر ہر شاعر کا تصرف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں تقدیم، تاخیر، توارد اور سرقہ کا بھی سوال نہیں اٹھتا، جب مال اپنا نہیں تو سرقے کا سوال کہاں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کس نے کیا اور کیسا کام لیا ہے''۔

(''میری تنقید ایک بازدید''، ص:۶۰)

شادؔ سعیِ پیہم کی اہمیت سے واقف تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ شادؔ آرٹ برائے آرٹ کے قائل تھے؛ لیکن شاعری کو وہ ایک ریاضت سمجھتے تھے۔

ریاضت، جانکاہی، ہنر یہ الفاظ (اور ایسے بہت سے الفاظ ان کے شعروں میں ملیں گے) اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں۔ ان میں بھی ٹینی سن کی طرح ایک Lapidarian Discontent تھا۔ وہ تکمیل کے خواہاں تھے اور خوب کو خوب تر بنانا چاہتے تھے''۔

(''میری تنقید ایک بازدید''، ص:۶۶)

''قدیم فنون کے مطالعے سے تخلیقی عمل کی فطرت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قدیم انسان کے لیے تخلیقی عمل زندگی کی استبدادیت سے نجات کا ذریعہ تھی۔ ان کی زندگی میں کوئی استقلال نہ تھا، اس کے آج کو کل کی خبر نہ تھی، عدم تسلسل سے آگاہی نہ تھی۔ آج کل میں وحشی قوموں کے افراد کو جو تہذیب سے کچھ شناسا ہو چکے ہیں، وعدے کا مفہوم سمجھانا مشکل ہے۔ وحشی فوری واقعے سے آگے نہیں سوچتا؛ بلکہ وقتی محرکات کے زیر اثر جبلی طور پر کام کرتا ہے؛ اسی لیے وہ کسی فن پارے کی تخلیق کرتا ہے تو یہ عمل گویا ایک ساحرانہ نذر عقیدت ہے اور اس طرح فوری طور پر وہ زندگی کی استبدادیت سے نجات پالیتا ہے اور وہ اپنے لیے ایک ایسی چیز تخلیق کر لیتا ہے، جو حقیقت مطلق کا ظہور ہے۔ گویا ایک لمحے کے لیے زندگی کسی سیل کو روک دیتا ہے اور ایک باقی رہنے والی ٹھوس اور مثبت حقیقت بنا لیتا ہے۔ زمان سے وہ مکان کی تخلیق کرتا ہے اور مکان کا حسین و دلچسپ خاکہ بنا لیتا ہے اور جذبات کے دباؤ سے یہ خاکہ معنی خیز ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے منتشر جذبات کو ایک نئی تنظیم، ایک نئی وحدت مل جاتی ہے''۔

(''ادبی تنقید کے اصول''، ص:۲۲)

''ناول محض قصہ نہیں، سیدھا سادہ نہیں، مختصر نہیں، اس میں پیچیدگی ہوتی ہے، پھیلاؤ ہوتا ہے، گہرائی ہوتی ہے۔ ناول میں قصہ نہیں؛ بلکہ قصے ہوتے ہیں۔ ایک مرکزی قصہ ہوتا ہے اور کچھ ضمنی قصے ہوتے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ قصے ضروری ہیں، یا غیر ضروری''۔

''خدائی اشاروں سے قطع نظر ناول لکھنا کچھ آسان کام نہیں۔ کام دشوار ہے، راہ میں مشکلیں بے شمار حائل ہیں۔ تفکر میں گہرائی اور خلوص کیسے آئے۔ وہ جاگتا خواب Vision جو ناولسٹ دیکھتا ہے، اس کے خالص جوہر تک کیسے پہنچا جائے اور یہ خواب

کیا ہے۔ یہ انسانی تجربوں کے امکانات کا خواب ہے، شعور کے چھپے ہوئے نہاں خانوں کا خواب ہے، جذبات وخیالات کی پیچیدہ، تاریک، دشوار گزار راہوں کا خواب ہے، فرد اور سماج کے تعلقات کی نازک گتھیوں کا خواب ہے، حیات وکائنات کی اتھاہ گہرائیوں کا خواب ہے''۔

''ناول لفظوں سے بنتا ہے جیسے شعر لفظوں سے بنتا ہے؛ لیکن اس حقیقت سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ ناول سے متعلق جو زیادہ سے زیادہ لکھا گیا ہے، یا ہم جو باتیں کرتے ہیں، ان سے یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ لفظوں کا ناول سے دور کا بھی واسطہ ہے۔ کبھی کبھی اسلوب کی بات نکل آتی ہے؛ لیکن بھولے سے، یا ضمنی طور پر۔ ناول کو قصے، کہانیوں کی ایک ارتقائی صورت سمجھا جاتا رہا ہے اور اب بھی سمجھا جاتا ہے؛ اس لیے پہلی نظر قصہ پر پڑتی ہے اور اکثر یہی آخری نظر بھی ہوتی ہے''۔

''ہم پلوٹ کی بات کرتے ہیں؛ لیکن پلوٹ کیا ہے؟ لفظوں کی ایک تنظیم ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ناولسٹ کیرکٹر کی تخلیق کرتا ہے؛ لیکن یہ تخلیق کیا ہے؟ لفظوں کو ایک خاص طور سے اکٹھا کرنے کا فن ہے۔ ہم ناولسٹ کے خواب، اس کی خصوصیتوں اور اس کی اہمیت کا سوال اٹھاتے ہیں؛ لیکن ہمارے پیش نظر صرف لفظوں کا ایک انفرادی پیٹرن ہوتا ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ الفاظ اور پیٹرن کیسے حسین، کیسے یکتا، کیسے موثر ہیں۔ وہ پڑھنے والے ہوں، یا نقاد، دونوں لفظوں ہی سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور الگ الگ تاثرات سے ہی مربوط، منظّم اور مکمل تاثرات کے پیٹرن تک پہنچتے ہیں''۔

(''ناول کا فن''۔ ''معاصر''، شمارہ:۲۴_۳_۱۹۷ء)

''اردو میں شاعروں کی زندگی کے نجی واقعات نہیں ملتے، یا ملتے ہیں تو بہت کم۔ اردو میں یہ شیوہ رہا ہے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطاست اور پھر یہ بھی کہ مردوں کو خیر کے ساتھ یاد کرو، جیسا کہ میں نے لکھا ہے، یہ طرزِ عمل کچھ اردو ہی تک محدود نہیں۔ بیسویں صدی سے پہلے یورپ میں بھی یہی پردہ داری ہوتی تھی، اچھی باتوں کا مبالغہ آمیز بیان اور بری باتوں کی پردہ داری، یہی شیوہ عام تھا، پھر اگر اردو میں کسی کو پردہ دری کا خیال نہ ہوا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بزرگوں کی خطاؤں، ان کی

کمزوریوں پر پردہ ڈال دیا گیا، پھر بھی یہ خطائیں جب حد سے گزر جاتی ہیں، جب ان کی کمزوریوں کا گلی کوچوں میں چرچا ہونے لگتا ہے، جب کجروی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ چھپائے نہیں بنتی تو اس کی طرف اشارہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ تذکروں کی ورق گردانی کیجیے تو ایسے ہی کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ ان اشاروں کو نظر انداز کرنا حقیقت سے گریز کرنا ہے۔۔۔۔۔۔اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ فن کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں، ان کی شخصیت میں کیسے پیچ وخم پیدا ہو گئے تھے، وہ فن کے سہارے ابھرتے ہیں، بلند پروازی کرتے ہیں اور پھر اسی فن کی بدولت قعر مذلت میں بھی گر جاتے ہیں''۔

(''شاعر لوگ''، ''معاصر''، شمارہ:۲۷، ص:۱۹)

''کسی بڑے کمرے میں فرش بچھ جاتا، وقت مقررہ سے پہلے ہی شائقین جمع ہونا شروع کرتے، مشاعرہ رات کو ہوتا اور دیر تک ہوتا، اکثر تین چار بجے صبح کو ختم ہوتا، شعرا اپنا کلام پڑھتے، جیسا کلام ہوا، ویسی داد ملتی۔ ہنگامے نہیں ہوتے، تالیاں نہیں بجتیں؛ یعنی اس قسم کی وحشیانہ حرکتیں نہیں ہوتیں، جن کا آج رواج ہو گیا ہے۔ اگر کسی کی غزل سپاٹ رہی تو اسے داد نہ ملی، یا آدھے دل سے داد ملی، اگر کسی معمولی شاعر نے لمبی غزل پڑھی، دوغزلہ سہ غزلہ پڑھنا شروع کیا اور سامعین کو کچھ دلچسپی نہ ہوئی تو ٹھنڈی خموشی سے داد ملی۔ اگر کسی نے ناموزوں اشعار پڑھے، یا کوئی شعر ایک بحر سے دوسری بحر میں جا پڑا، یا کوئی حرف ساقط ہو جاتا، یا محاورہ کی غلطی ہوئی تو جو ان خامیوں کو محسوس کرتے تو زیر لب مسکراہٹ ہی دوڑ جاتی، یا شاعر کو اپنی غلطی پر متنبہ کرنے کے لیے کہتے، اس شعر کو پھر پڑھیے گا۔ مشاعروں میں زیادہ سننے والوں کا ہجوم رہتا، کچھ سمجھتے، کچھ نہ سمجھتے؛ لیکن خوش سبھی ہوتے اور داد سبھی دیتے اور داد اچھے برے سبھی شاعروں کو ملتی''۔

(''اپنی تلاش میں''۔ حصہ اول، ص:۴۱)

''دماغ کی تربیت اور ترقی کی یہ صورت نہیں کہ اسے آوازوں کی یورش سے بیکار بنا دیا جائے''۔

''یہ ریڈیو کا مقصد ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ، بلندی اور پستی، ذہانت اور کم عقلی کا فرق دنیا سے مٹ جائے اور خدا کی ساری مخلوق بس ایک رنگ میں رنگ جائے''۔

''ہماری سوشل زندگی پر ریڈیو کا خراب اثر ہوتا ہے۔ ملنے جلنے، تبادلہ خیالات، مختلف شخصیتوں کے میل یا تصادم سے جو باتیں حاصل ہوتیں، وہ اب مفقود ہوگئی ہیں اور اس نقصان کا ذمہ دار ریڈیو ہے''۔

''جو اخباروں میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، انہیں پڑھنا اپنی زندگی کا سب سے بڑا فرض سمجھتے ہیں، ان کا دماغ چست و چالاک نہیں دیوالیہ ہو جاتا ہے''۔

(''ریڈیو اور کلچر''۔ ''معاصر''، فروری۔ جون ۱۹۴۴ء)

''وزن کا تقاضا فن کار کو گویا ایک چیلنج ہے اور فن کار کو اس چیلنج سے بھاگنا نہیں چاہئے''۔

''اس کے فن کا تقاضا ہے کہ وہ وزن اور لفظوں کی تربیت میں جو مخاصمت ہے، اسے دور کرے۔ مخاصمت کو ایک کھیل، دلچسپ کھیل بنا دے اور وزن سے سہارا لے کر نثری ترتیب سے زیادہ اچھی، زیادہ معنی خیز ترتیب لفظوں میں پیدا کرے''۔

(''عملی تنقید''۔ ص:۱۷۸)

''لانجائنس کے پاس کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں اور اس کے پیش نظر کوئی عملی مقصد، جیسے ترغیب بھی نہیں اور کوئی اخلاقی نقطۂ نظر بھی نہیں۔ وہ صرف لطف اندوزی، بےخودی، وجد کی باتیں کرتا ہے اور یہی اس کی تنقید کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اخلاقی معیار کو پست کرنا چاہتا ہے؛ لیکن اصولی طور پر وہ اخلاقی معیار کو جمالیاتی معیار سے کم اہمیت دیتا ہے۔ وہ ابتری نہیں چاہتا، افراتفری نہیں چاہتا؛ لیکن اس نے بار بار اس بات کی وضاحت کی ہے کہ قانون کی پابندی، جدول کش اور روک گھڑی کی شاعری میں جگہ نہیں''۔

''لانجائنس اس حقیقت سے؛ یعنی فن کا مقصد مسرت ہے کے نتائج سے بھاگتا نہیں، اس پر تفصیلی بحث کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بخلاف ارسطو اور ہورلیس کے ادب کو مختلف صنعتوں، شعبوں، قسموں کا گوشوارہ نہیں شمار کرتا''۔

(قدیم مغربی تنقید۔ ص:۷)

نمونۂ نظم

یہ مری حسین دنیا   خواب ہے کہ افسانہ
اس طلسم رنگیں میں   نور بھی ہے نکہت بھی
اس کو میں نے دیکھا ہے   جب کہ ظلمت شب میں
نرم نرم ریشم سی   چاندنی فضاؤں میں
نور پھیل جاتا ہے   اور ننھے تاروں کی
آنکھیں جگمگاتی ہیں   اور کہکشاں اپنی
سیمگوں بہاروں میں   چاند کو بلاتی ہے
اور میں نے دیکھا ہے   صبح کی ہواؤں میں
سورج اپنی کرنوں کا   جال جب بچھاتا ہے
حسن صید ہوتا ہے   موج نور اٹھتی ہے
اس حسین دنیا میں   میں نے یہ بھی دیکھا ہے
صبح کی فضاؤں میں   رنگ ہے لطافت ہے
نرم نرم سبزوں پر   اوس جگمگاتی ہے
اور اوس کھا کھا کر   کلیاں مسکراتی ہیں

رنگ و بو کے پردوں پر   بجلیاں چمکتی ہیں
یہ مری حسیں دنیا   شعر ہے کہ افسانہ

(''۴۲ نظمیں''،ص:۳۳۔۳۴)

❋

مجھ سے کہتا ہے میرا کاسۂ سر
حسن فانی ہے ، عشق بھی فانی
شعر فانی ، سخن بھی فانی ہے
یہ جہاں کیا ہے ؟ اک طلسم خیال
میں ہی ظاہر ہوں، میں ہی باطن ہوں
استخواں باقی ، استخواں باقی
یہ سر پر غرور کس کا ہے؟
ٹھوکروں سے جو یوں شکستہ ہے
سنو کہتا ہے کیا یہ کاسۂ سر
بود آدم نمود شبنم ہے
ایک دودم میں پھر ہوا ہے یہ
آرہی ہے یہ کیسی اب آواز ؟
بج رہے ہیں یہ استخوں کے ساز
خاک میں رشک آسماں سے ملی
ہائے کیسی بلند ایوانی
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
دیکھو میری یہ کار سازی ہے
خاک میں یوں جو ترک تازی ہے
موت سے مجھ کو رستگاری ہے

میرا سکہ جہاں میں جاری ہے
استخواں باقی ، استخواں باقی

(''۴۲ نظمیں''۔ص:۴۱۔۴۲)

❋

دریا کی مست لہریں بے چین ہو رہی ہیں
کیا تیز و تند جھونکے رہ رہ کے آرہے ہیں
قندیلیں بلبلوں کی اب جھلملا رہی ہیں
ظلمت کے جال میں لو سورج تڑپ رہا ہے
کیا کالے کالے بادل اللہ! چھا رہے ہیں
بجلی کڑک رہی ہے، طوفاں امنڈ رہے ہیں
تاریکیوں کے دستے ہر سمت بڑھ رہے ہیں
فوج یزید گویا یلغار کر رہی ہے
حسن ازل کدھر ہے؟ روپوش ہو گیا ہے
ظلمت ہے اس کا ماویٰ، ظلمت ہے اس کا ملجا
ظلمت سے وہ بنا ہے، ظلمت میں جا چھپا ہے
ہستی کا دل ہے ظلمت، ظلمت میں نور کیوں ہے
کانٹوں میں پھول کیوں ہے، مٹی میں جان کیوں ہے
شاہیں ہے کیوں ہوا میں، آب وسراب کیوں ہے
ساز عدم میں پنہاں سوز حیات کیوں ہے؟

(''۴۲ نظمیں''،ص:۱۶۵۔۱۶۶)

تنہائی کے یہ دن ہیں   تنہائی کی یہ راتیں
اے محرم تنہائی   یہ روح کا سناٹا
دل کو مرے بھاتا ہے   گلشن کی بہاروں سے
صحراں کے غزالوں سے   ان چاند ستاروں سے

میں دور پھٹکتا ہوں پھولوں سے بھی پیارا ہے
دل کا مرے ویرانہ
میں کون ہوں میں کیا ہوں اک لعل ہوں مدفن میں
اک پھول ہوں صحرا میں اک شمع ہوں جلتے میں
جس سے پرِ پروانہ میں حسن سے بیگانہ
میں عشق سے بیگانہ میں شعر نہ افسانہ
پھر کیوں یہ خلش دل کو رہ رہ کے ستاتی ہے
کیوں درد یہ اٹھتا ہے وحشت مجھے ہوتی ہے

(''۴۲ نظمیں''۔ص:۴۵۔۴۶)

***

یہ خواب ناز کب تک، اے مست ناز دیکھو
دریا کے دل میں روشن سونے کی کہکشاں ہے
کیسے وہ اٹھ کے آئے وہ دور سو رہی ہے
فتنے ہزار اٹھیں، یہ آسمان ٹوٹے
اس کی جبیں پہ لیکن کوئی شکن نہیں ہے
وہ شرمگیں نگاہیں، وہ نازنیں ادائیں
وہ بال بھورے بھورے الجھے ہوئے جبیں پر
نازک عذار رنگیں، پھولوں میں جیسے شعلے
وہ رنگ وبو کی تتلی، خوش رنگ، پیاری پیاری
پھولوں سے وہ بنی ہے، تاروں میں وہ پلی ہے
میں اس کو چاہتا ہوں، وہ مجھ کو چاہتی ہے

(''۴۲ نظمیں''۔ص:۱۷۲۔۱۷۳)

***

چمکو چمکو فضا میں اے لفظو
میری دنیا کو جگمگا جاؤ
نور کی ندیاں بہا جاؤ
تم سے روشن فلک پہ ہیں تارے
کہکشاں ، سورج اور سیارے
پھولوں میں یہ مہک تمہاری ہے
بلبلوں میں چہک تمہاری ہے
ابرِ رحمت ہو ، آب حیواں ہو
تم سے سیراب کیوں نہ انساں ہو
مرہم زخم کائنات ہو تم
اول و آخر حیات ہو تم

(''۴۲ نظمیں''۔ص:۵۹۔۶۰)

***

مرے خیال کا کہسار کون دیکھے گا
مری بلندی رخشاں پہ کون آئے گا
چمک چمک کے اسے کون جگمگائے گا
یہ خاک وباد سے میری، یہ برق وباراں سے
ان آبشاروں سے طغیانیٔ عناصر سے
بپھرتے کھولتے طوفاں سے کون کھیلے گا

قمر کا خوف نہ ہے خطرۂ سحر تم کو
بتاؤ کس نے پنھائی قبائے زر تم کو
فلک سے دور دیا ہے زمیں نے گھر تم کو
مآل شعر کی کیسے ہو پھر خبر تم کو
چلو دکھاتا ہوں شاہیں کا میں جگر تم کو

(''۲۵ نظمیں''۔ص:۱،۲)

آج کی رات وہ آئے گا ضرور آئے گا
منتظر ہوں میں وہ سرمست غرور آئے گا
سنو یہ میرے کواڑوں پہ ہے دستک اس کی
میرے دروازے کی کنڈی کو ہلاتا ہے وہی
ٹھہرو اس زلف پریشاں کو بنا لوں تو چلوں
اپنی پژمردہ جوانی کو سجالوں تو چلوں
کالے بادل کی گھٹائیں، زر افشاں کے نجوم
روشن آنکھوں کے چھلاوے،لب رنگیں کے کنول
لالے رخسار کے، ابھرے ہوئے سینوں کے انار
ہاں! ذرا حسن کے جادو کو جگالوں تو چلوں
میری سانسوں کے سوئے ہوئے نغمے جاگے
پھر رگوں میں مری اٹھنے لگیں خوں کی موجیں
پھر دل سرد میں جلتے ہوئے شعلے بھڑکے

(''۲۵ نظمیں''۔ص:۴۴۔۴۵)

❋

کیسا جادو ہے ، جوانی ہے فسوں ساز کوئی
دیوتا دیکھو یہ آکاش سے اترا ہے ابھی
چال اس کی ہے کہ سرمست بھی،ہشیار بھی ہے
شیر کی شان کبھی اور کبھی چیتے کی لپک
اس کی آنکھوں سے برستے ہیں وہ براّں نیزے
سنگ کو چیرتے ہیں اور دل آہن بھی
ایسی ان کی ہے حرارت کہ پگھل جاتا ہے
پھر یہ دل میرا جو شیشہ بھی ہے اور پھول بھی ہے

کیسا یہ نرم ہے،شفاف ہے،نازک بھی ہے
کیسے ان جلتے ہوئے نیزوں کو روکے ٹوکے
وہ شکاری ہے یہاں بہر شکار آیا ہے
دل کا صیاد ہے وہ ، جان کا صیاد ہے وہ
نرم ونازک سا یہ دل اور مری ننھی سی یہ جاں
آہ،ارمانوں کے طائر، یہ امیدوں کے ہرن
مچھلیاں شوق کی جو شوخ بھی خوش رنگ بھی ہیں
اس کے داموں سے،کمندوں سے اوران جالوں سے
کیسے بچ نکلیں، بھلا جانیں بچائیں کیسے

(''۲۵ نظمیں''۔ص:۸۲۔۸۳)

❋

مری جاں کہو کیسا دلکش سماں ہے
جو تار نظر کو یہاں گوندھتا ہے
اسے دست قدرت نے خود ہے سنوارا
پہاڑ اک طرف سر اٹھائے کھڑے ہیں
سرِ کوہ تک سبز جنگل بھرے ہیں
بلندی پہ کچھ بدلیاں ہیں خراماں
کہیں سرمئی ہیں،کہیں کالی کالی
کہیں نقرئی سی وہ ان کی جھلک ہے
سفید اون جیسے کہ بکھری ہوئی ہو
ارے وہ چمکتی ہیں کچھ بجلیاں سی
گرج ہلکی ہلکی سی کچھ رعد کی ہے
کہ جیسے کہیں دور صحن چمن میں
سر شام بچے ہوں کچھ شور کرتے

اِدھر آبشاروں کی نہریں رواں ہیں
اُدھر طائرِ نغمہ زن نغمہ خواں ہیں

(”۲۵ نظمیں“۔ص:۱۳۶۔۱۳۷)

مرے خیال کی دنیا میں پھر وہ آ ہی گیا
نظر پہ چھایا، دل وجاں میں آج چھا ہی گیا
بتاؤ کس چمنستان کا وہ گلِ تر ہے
فلک کا دیکھو تو کیا تابناک اختر ہے
نظر میں اس کی محبت کی چاندنی نکلی
لبوں پہ اس کے محبت کے زمزمے چہکے
شرارے کیسے محبت کے سانس سے نکلے
رگوں میں کیسے محبت کے ولولے بھڑکے
بہارِ حسن یہ تازہ بہار کیسی ہے
بہارِ دل بھی وہی ہے، بہارِ جاں بھی وہی

(”۲۵ نظمیں“۔ص:۱۹۵)

جو کانٹے نہ ہوں گل کو پھر کون سونگھے
جو پتھر نہ ہوں کون ریشم سے لپٹے
جو ظلمت نہ ہو روشنی کون دیکھے
جو آنسو نہ ہوں کون پھر مسکرائے
نہ غم ہوں تو دل کیسے خوشیاں منائے
یہ پستی دکھاتی ہے راہ بلندی
برائی سکھاتی ہے کیا کیا بھلائی
عدم سے ابھرتی ہے یہ نبضِ ہستی

اجل سے نکھرتی ہے کیا زندگانی
یوں ہی یہ گھڑی دل کی چلتی رہی ہے
زمیں آسماں میں ، مکاں لامکاں میں
یہی اک گھڑی ہے جو چلتی رہے گی

(”۲۵ نظمیں“۔ص:۷۹۔۸۰)

کس نے یہ آج بلایا ہے مجھے
میں ہوں اور بسترِ تنہائی ہے
بوریا ہے کہ ہے یہ نقشِ حصیر
میرے سونے سے مکاں میں اب تو
ساز و سامان نہیں ہے کچھ بھی
مخمل و اطلس و دیبا بھی نہیں
روشن آئینے نہ رنگیں قالیں
شیریں نغمے ہیں نہ بجتے ہوئے ساز
شعلۂ رقص نہ چھم چھم کا رباب
اور دیکھو تو مرے گلشن میں
روپ ہے یہ کہ ہیولا ہے کوئی
مخمل سبزہ ہے پر سبز نہیں
شبنم آتی ہے تو اڑ جاتی ہے
غنچے ہیں پر وہ چٹکتے ہی نہیں
پھول ہیں پر وہ مہکتے ہی نہیں
لالۂ وگل کی وہ رنگت ہے کہاں
چشمے بہتے ہیں تراوت ہے کہاں

کوئل آتی ہے پہ کوکو ہی نہیں
دیکھو بلبل کی زباں بھی ہے خموش

(''۲۵نظمیں''۔ص:۳۱۳،۳۱۴)

❀

اے اسیر شام ، پابند سحر
توڑ زنجیروں کو ، زنداں سے نکل
وقت ہے آزاد ، زندانی نہ بن
اپنی امیدوں کا دامن چھوڑ دے
اپنے ارمانوں کا شیشہ توڑ دے
وصل کی گھڑیوں کو گننا چھوڑ دے
صبح خنداں کا چہکنا بھول جا
شام گریاں کا یہ رونا بھول جا
ا ب سراب حسن سے منہ موڑ لے
یہ محبت کا دھند لکا چھوڑ دے

اور وہ آواز کہتی ہے مجھے
چاند تو کم ضو ہے اب اس کو نہ دیکھ
مہر عالمتاب سے آنکھیں ملا
چھوڑ یہ اندیشۂ سود و زیاں
وہم کے پھیلے ہوئے کہرے کو چھوڑ
برہمن کو چھوڑ واعظ کو بھی چھوڑ
اس فریب مندر و مسجد کو چھوڑ
اور اصنام خیالی کو بھی توڑ
پر شکستہ ہے یہ شاہین خیال

ولولوں کا لٹ گیا حسن و جمال
اب عزائم کا کہاں جاہ وجلال
کیسی دوزخ اور یہ جنت ہے کیا
اب نگاہ حور میں شوخی کہاں

(''۲۵نظمیں''۔ص:۳۲۶)

❀

کہاں ہے وہ گل رعنا ، وہ سرو رعنائی
اسی کی راہ میں میں نے بچھائی تھیں آنکھیں
اسی کو میں نے بسایا تھا گلشن دل میں
مرے خیال کے رنگین لالہ زاروں نے
جوان خوابوں کی پھیلی ہوئی بہاروں نے
یہ میرے شعروں کے رخشندہ چاند تاروں نے
اسے سنوارا تھا ، اس کو حسیں بنایا تھا
جو میرے دل میں امیدیں مچلتی رہتی تھیں
جو ولولے ، جو امنگیں ، جو شوق داماں تھے
انہیں کا ہار بنا کر اسے پہنایا تھا
شرارے سانسوں سے میری جو اڑتے رہتے تھے
جو میری آنکھوں میں چنگاریاں چمکتی تھیں
رگوں میں،دل میں جو اک آگ سی دھڑکتی تھی
انہیں سے ہیروں کا یہ تاج اسے پہنایا تھا!
میرا وہ ہار کہاں ہے ، مرا نگار کہاں
مرا وہ تاج کہاں ہے ، مرا سراج کہاں

(''۲۵نظمیں''۔ص:۱۳۰)

اختتامیہ

پروفیسر کلیم الدین احمد کی اردو تنقید کا دور ۱۹۳۹ء میں عظیم الدین احمد کے شعری مجموعے ''گل نغمہ'' کے مقدمے سے شروع ہو کر ان کی وفات ۱۹۸۳ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس پینتالیس سالہ دور میں انہوں نے اردو تنقید، شاعری، تذکرے، داستان اور کئی اہم اصناف کا غیر جانبدارانہ، مدلل اور بیباک جائزہ لیا۔ کلیم الدین احمد کے معیارِ نقد کو ایک طرف مشرقی ادبیات اور گھر کے مشرقی ماحول نے پروان چڑھایا تو دوسری طرف انگریزی، فرانسیسی تنقید، لندن اور کیمبرج کی تعلیم اور ایف آر لیوس، آئی اے رچرڈز، ٹی ایس ایلیٹ جیسے اساتذہ وناقدین نے جلا بخشا، انہوں نے مغربی تنقید کے معیار و وسعت سے متاثر ہو کر ہی اردو تنقید کے وجود سے انکار کیا اور اس کے اصول وضوابط کی عدم موجودگی کے شاکی رہے۔ ان پر ایک الزام ہمیشہ لگایا جاتا رہا ہے کہ وہ انگریزی ادب سے مرعوب ہیں اور اردو کی ہر تحریر کو مغرب کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیم الدین احمد کا معیارِ نقد مغربی ہے؛ مگر اسی مغربی معیار سے انہوں نے جو اردو شعر ونقد کے اصول ترتیب دیئے اس سے اختلاف کی گنجائش بمشکل نظر آتی ہے۔ ان کا مقصد اردو ادب کی تذلیل نہیں ہے، بس وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا اردو ادب بھی مغربی ادب کا معیار حاصل کر لے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تذکروں سے داستان تک اردو کی اہم اصناف اور اہم لکھنے والوں کا جب تجزیہ کیا تو مایوسی ہاتھ لگی۔ ان کی نظر میں تذکروں کی اہمیت خام مواد کی ہے، ان میں موجود خیالات کو تنقید نہیں کہا جا سکتا۔ اردو غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے؛ کیوں کہ اس میں ربط اور ارتقائے خیال کا فقدان ہے۔ حالی کے خیالات ماخوذ ہیں، احتشام حسین مسائل سلجھانے کے بجائے الجھا دیتے ہیں، آل احمد سرور بیباک اور حتمی رائے پیش نہیں کر پاتے، اقبال شاعری نہیں پیغامبری کرتے ہیں، ترقی پسند شاعری محض چیخ وپکار، پروپیگنڈہ اور نعرہ ہے۔ میر، سودا، درد، مومن، ذوق، غالب سب بزرگ شاعر ہو سکتے تھے، اگر وہ نظمیں لکھتے۔ اسی طرح شبلی، عبدالحق، محمد حسن، مجنوں، اختر رائے پوری، رشید احمد صدیقی، فراق، حسن عسکری، اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے

ناقدین سے بھی وہ پوری طرح مطمئن نظر نہیں آتے ہیں۔ صرف داستانوں سے بہت حد تک وہ مطمئن ہوتے ہیں اور انہیں قدیم ادب کا سرمایہ قرار دیتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کی یہ تنقید بظاہر جذباتی، رومانی اور افراط وتفریط پر مبنی نظر آتی ہے؛ مگر ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی اکثر باتیں دلائل وشواہد کے ساتھ رکھی ہیں۔ ان کے سخت اور بے لچک انداز نقد نے سہل پسندی پر روک لگائی اور ادب کو سیاست یا خطابت کی راہ پر چلنے سے روکا۔ انہوں نے وہی کام کیا، جو ایک باغباں باغ کی حفاظت اور پرورش کے لیے کرتا ہے۔ انہوں نے بیدردی سے ''باغ اردو ادب'' کو نقصان پہنچانے والے عناصر سے پاک کیا اور اردو تنقید کا ایک ایسا منفرد اسلوب پیش کیا، جو آج تک ادیبوں اور ناقدوں کے تنقیدی شعور کی تربیت کر رہا ہے۔ کلیم الدین احمد نے جو کچھ لکھا جی جان سے لکھا اور ہر موضوع کا حق پوری طرح ادا کیا، ان کی زبان سادہ اور انداز بیان معروضی، استدلالی اور سائنٹفک ہے۔ تحریر میں جگہ جگہ انشائی شگفتگی بھی ملتی ہے اور طنزیہ وظریفانہ لطافت بھی۔ اردو تنقید میں سنجیدگی، توازن اور حسن تنظیم کی سب سے اچھی مثال کلیم الدین احمد کی تنقید سے دی جا سکتی ہے۔

کلیم الدین احمد کی دیگر ادبی خدمات مثلاً اپنی تلاش میں، میری تنقید ایک باز دید، میر انیس، معاصر، جامع انگریزی اردو لغت، Idols، دیوان جوشش، کلیات شاد اور مختلف مضامین وتبصرے ان کی علمیت، وسیع معلومات، ندرت خیال وفکر اور معروضی مطالعیت پسندی کی دلیل ہیں۔ ''اپنی تلاش میں'' جہاں اردو کی اچھی خودنوشتوں میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہیں ''جامع انگریزی اردو لغت'' کو ایک بڑا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ''معاصر'' میں اگر وہ ایک دوررس اور بالغ نظر ادیب نظر آتے ہیں تو Idols میں وہ ایک فلسفی اور مفکر کی صورت میں اپنی شناخت قائم کرتے ہیں۔ شاعری کے میدان میں اگرچہ وہ بہت معروف اور کامیاب نظر نہیں آتے؛ مگر وہ اپنی شاعری میں ان تمام خامیوں کو دور کرتے ضرور نظر آتے ہیں، جن کی شکایت انہیں اردو شاعری سے تھی۔ ان کی مختصر، یا طویل نظمیں اپنے اندر تہداری رکھتی ہیں اور پیچیدگی بھی۔ ان میں موضوعات کا تنوع، ڈرامائی انداز، ہندوستانی فضا اور بیان کی جدت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

گویا ان کی متنوع خدمات اور تحریروں کو نظر میں رکھا جائے، ان کی ناقدانہ جسارت وجرات کی قدر کی جائے اور ان کی دانشورانہ وعالمانہ تحریروں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا مبالغے پر محمول نہیں کیا جائے گا کہ کلیم الدین احمد ایک نابغہ، ایک مفکر اور صف اول کے ناقد تھے۔

کتابیات

نمبرشمار	نام کتاب	مصنف/مرتب	ناشر	سنہ طباعت
۱	اپنی تلاش میں (حصہ اوّل)	کلیم الدین احمد	کلچرل اکیڈمی، گیا	۱۹۷۵ء
۲	اپنی تلاش میں (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد	بہار اردو اکادمی پٹن،ہ	۱۹۸۷ء
۳	اپنی تلاش میں (حصہ سوم)	کلیم الدین احمد	دائرہ ادب، پٹنہ	۱۹۸۲ء
۴	اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، پٹنہ	۱۹۸۲ء
۵	اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ اوّل)	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، پٹنہ	۱۹۸۵ء
۶	اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد	ایوان اردو، پٹنہ	۱۹۶۶ء
۷	سخن ہائے گفتنی	کلیم الدین احمد	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۵ء
	عملی تنقید	کلیم الدین احمد	اردو کتاب گھر، حیدرآباد	۱۹۶۶ء
	قدیم مغربی تنقید	کلیم الدین احمد	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۴ء
	کلیات شاد (۳/جلدیں)	کلیم الدین احمد	بہار اردو اکادمی	۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۸ء
	میر انیس	کلیم الدین احمد	بہار اردو اکادمی	۱۹۸۸ء
	میری تنقید ایک باز دید	کلیم الدین احمد	خدابخش لائبریری، پٹنہ	۱۹۷۸ء
	اردو تنقید کا ارتقا	عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۲ء
	ارسطو سے ایلیٹ تک	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	
	بہار میں اردو تنقید	اعجاز علی ارشد	مگدھ پنچ، پٹنہ	۱۹۸۱ء

بہار کی بہار (حصہ اول)	اعجاز علی ارشد	خدابخش لائبریری	۲۰۱۰ء
جدید اردو تنقید: اصول ونظریات	شارب ردولوی	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۲ء
حالی سے کلیم تک	سید نواب کریم	تخلیق کار پبلشرز، دہلی	۱۹۹۳ء
حیات کلیم	سید محمد حسنین	مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا	۱۹۷۷ء
فن تنقید اور تنقید نگاری	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۳ء
کلیم الدین احمد کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ	وارث الرحمٰن	پٹنہ یونیورسٹی	۱۹۸۱ء
کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر	ممتاز احمد	بہار اردو رائٹرس سرکل	۱۹۶۷ء
کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ	ابرار رحمانی	تخلیق کار پبلشرز، دہلی	۱۹۹۹ء
کلیم الدین احمد سیمینار کے مقالے	مشتاق احمد نوری	بہار اردو اکادمی، پٹنہ	۱۹۹۶ء
کلیم الدین احمد (مونوگراف)	وہاب اشرفی	ساہتیہ اکادمی، دہلی	۲۰۱۲ء
نذر کلیم	بہار اردو رائٹرس سرکل، پٹنہ		۱۹۷۴ء

✻

کلیم الدین احمد ناقدین و محققین کی نظر میں

کلیم الدین احمد اردو کے واحد نقاد ہیں، جن کی حمایت اور مخالفت میں لکھنے والوں کی تعداد تقریباً یکساں رہی ہے؛ مگر ان کے نظریات وخیالات سے عدم اتفاق رکھنے والے مخالفین نے بھی ان کی تنقیدی اور ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ ذیل میں چند منتخب تاثرات پیش کئے جا رہے ہیں، جن میں ان سے متفق حامیوں کے علاوہ مخالفین کی آرا بھی شامل ہیں۔

پروفیسر سید محمد حسنین:

''کلیم الدین احمد نقاد ہیں اور طنز نگار بھی ہیں، انہوں نے اپنی تنقید میں طنز وہجو سے وہ مصرف لیا ہے، جو قدرت نے قوم نوح کے لیے ابر باراں سے۔ ''فن داستان گوئی''، ''اردو شاعری پر ایک نظر'' اور ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں معیاری طنز وہجو کے جیسے براق و بالتصریح نمونے ملتے ہیں، وہ آپ اپنی نظیر ہیں۔ اردو دنیا کلیم الدین احمد سے بڑا طنز نگار نقاد پیدا نہ کر سکی''۔ (''حیات کلیم''، ص:۱۲)

پروفیسر عبد المنان بیدلؔ:

''کلیم الدین احمد کے معرف ومعترف ملک کے معروف ادیب بھی ہیں اور مستند شعرا بھی۔ کلیم کے علمی پایہ کو، ان کے معیار نقد وتحقیق کو اور ان کے اکتسابات علمی کی تفصیل کو بالغ النظر انشا پردازوں، مستند نقادوں اور نامور محققوں کے مقالوں میں

پڑھئے۔ پڑھ لیجئے گا تو آپ کی زبان پر بے ساختہ یہ مشہور شعر آ جائے گا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(''حیات کلیم''، ص:۵۳)

قاضی عبدالودود:

''کلیم الدین احمد نئی بات صرف اس لیے تو نہیں کہتے کہ وہ نئی ہے؛ لیکن اگر کوئی بات ایسی کہنی چاہتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ پیچھے ہاں میں ہاں ملانے والوں کی ایک جماعت موجود ہے، یا نہیں؟ وہ جو کچھ کہتے ہیں، کھلم کھلا کہتے ہیں اور طنز سے خواہ خفی ہو، یا جلی، بہت کام لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ان کے معاصرین میں کوئی نقاد ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا''۔ (''حیات کلیم''، ص:۶۵۔۶۸)

پروفیسر اختر اورینوی:

''صنف غزل پر کلیم الدین احمد کی تنقید کو بعض لحاظ سے صحیح سمجھتا ہوں اور بعض اعتبار سے غیر صحیح؛ تاہم یہ تو تسلیم کرتا ہی ہوں کہ کلیم کا نظریہ اردو شاعری کے لیے ایک تنظیمی تازیانہ ہے۔ وہ بے ربطی، بدنظمی، لامرکزیت، آوارگیٔ خیال، انتشار تجربہ، ایک سطحی حرکت، نامربوط ارتقا پر زجر وتوبیخ کرتا ہے۔ وہ غزلوں اور نظموں کے تخلیقی اور تعمیراتی نقائص سے دوٹوک بحث کرتا ہے اور جرات کے ساتھ اردو دنیا کی توجہ تنظیم، ربط وضبط اور توازن کی طرف منعطف کراتا ہے''۔ (''تحقیق وتنقید جدید''، ص:۱۶۳)

پروفیسر آل احمد سرور:

''کلیم الدین احمد بہت سے نقادوں سے زیادہ سوچی ہوئی اور خیال آفریں باتیں کرتے ہیں؛ مگر ان کی تنقید اور بلند ہوتی اگر وہ اپنے قدیم سرمایہ سے اس قدر بیزار نہ ہوتے اور ان کے یہاں تاریخ اور ادب کے تسلسل کا شعور اور زیادہ نمایاں ہوتا اور ان کی تنقید گلستاں میں کانٹوں کی تلاش نہ بن جاتی''۔ (''تنقید کیا ہے''، ص:۲۰۲)

پروفیسر سید احتشام حسین:

''سوال یہ ہے کہ ایسی موہوم اور خیالی چیز کے لیے جس کا وجود ہی نہیں، ڈھائی

سو صفحوں کی ایک کتاب لکھ کر معشوق کی موہوم کمر کی طرح اسے تلاش کرنا کہاں کی دانائی ہے؟ جس طرح معشوق کی کمر کا نہ ہونا صرف شاعر کے واہمہ کا مفروضہ ہے، اسی طرح تنقید کا نہ ہونا کلیم الدین احمد کا وہم ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کمر بھی ہے اور تنقید بھی''۔(''روایت اور بغاوت''،ص:۱۳۰)

پروفیسر عبد المغنی:

''کلیم الدین احمد کا کردار ان سب لوگوں میں ممتاز؛ بلکہ اردو نقادوں میں ممتاز ترین اور نہایت متنازعہ فیہ ہے۔ان کی انفرادیت اتنی نمایاں ہے کہ ایک عرصہ تک ان کو اردو دنیا میں ایک اجنبی حملہ آور سمجھا جاتا رہا اور ادبی سرحدوں کی حمایت وحفاظت کے لیے بڑے بڑے معرکے برپا کئے گئے۔ان پر تنقید کم تعریض زیادہ کی گئی۔کلیم صاحب پر بہت بڑا الزام یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو انگریزی معیاروں سے جانچنے کی سعی کی ہے اس لیے وہ اردو کے غدار ہیں، حالانکہ حقیقت یوں ہے کہ موصوف صرف انگریزی نہیں، عالمی ادب کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد ایک خاص نتیجے پر پہنچے ہیں۔انہوں نے اپنے مخصوص فنی نقطۂ نظر سے ہماری ادبی روایت کا جائزہ لیا ہے۔ہمارے فن پاروں کو پرکھا ہے اور صرف اصلاحِ مذاق نہیں انقلاب ذوق کا سامان کرنے کی جدوجہد کی ہے۔کلیم صاحب کی نیت اور صلاحیت پر شک نہیں کیا جاسکتا''۔(''نقطۂ نظر''،ص:۱۱۲)

پروفیسر محمد حسن:

''کلیم الدین احمد کی عملی تنقید کا اردو کے تنقیدی ادب میں ایک اہم مرتبہ ہے۔انہوں نے اردو تنقید کو زیادہ معروضی، زیادہ متنی اور زیادہ بااصول ہونا سکھایا ہے۔وہ محض لفظوں کے طوطا مینا نہیں بناتے؛ بلکہ شعر کے اندرونی دروبست کی مختلف کڑیاں واضح کرکے ان کی مدد سے مقدمات قائم کرتے ہیں اور پھر ان مقدمات کے وسیلے سے نتیجوں تک پہنچتے ہیں اور شعری تخلیق اور خود تخلیق کار کا ادبی مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس اعتبار سے ان کی خدمات کا اعتراف لازم ہے''۔(''کلیم الدین احمد سیمینار کے مقالے''،ص:۱۷)

پروفیسر صدر الدین فضا شمسی:

''کلیم الدین احمد بلاشبہ اپنے دور کے عظیم شاعر ہیں؛ بلکہ اردو زبان کے وہ منفرد

شاعر ہیں، جنہوں نے اس زبان میں رنگا رنگ تجربے، کامیاب تجربے اور نئے تجربے کئے اور اس طرح کہ گل چینِ بہار کو دامان تنگ کا گلہ کرنے کا موقع نہ رہا، چوں کہ یہ تجربے نئے اور پہلے ہیں، اس لیے الفاظ کہیں کہیں ناہموار آ گئے ہیں اور بعض بیان سمپل نہیں معلوم ہوتے۔خیالات وتجربات بسیط اور تہہ در تہہ ماحول سے گزرے ہیں، اس کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے جذبات وتجربات کو بھی تہہ در تہہ، مبہم اور مرکب انداز میں پیش کیا جائے؛ تاکہ حیات زندگی ہر موڑ پر ان سے کام لے اور اپنی زیست کا سامان فراہم کرے، ایسا کرنے میں کلیم الدین احمد بعض انگریزی شعرا کے رہین منت ہیں، جنہوں نے تشبیہ، استعارے اور کنایے کی زبان میں جلے دل کے پھپھولے توڑے ہیں''۔(''۴۲ نظمیں ایک روایت ایک بغاوت''،ص:۱۶۵)

پروفیسر عبادت بریلوی:

''ان کی طبیعت کا انتشار انہیں ایک جگہ برقرار نہیں رہنے دیتا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے تنقیدی نظریات میں تضادی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔وہ عینیت کو بھی نہیں چھوڑ سکتے اور نہ حقیقت پسندی سے الگ ہٹ سکتے ہیں''۔(''اردو تنقید کا ارتقا''،ص:۴۰۲)

شمس الرحمٰن فاروقی:

''حالی کی طرح کلیم الدین احمد بھی بہت موثر ثابت ہوئے''۔(''ادبی تخلیق اور ادبی تنقید''،ص:۷۳)

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی:

''عملی تنقید اردو میں نہ ہونے کے برابر ہے۔کلیم الدین احمد نے اس طرز کو باقاعدہ شروع کیا''۔(''تعبیر خیال''۔ص:۶۲)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری:

''کلیم الدین احمد اچھی منضبط اور گتھی ہوئی نثر؛ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صحیح عبارت لکھنے کا کوئی سلیقہ نہیں رکھتے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ انشا کے بنیادی اصول سے قطعاً ناواقف ہیں۔انگریزی زبان کے الفاظ جوں کا توں رکھ دینا جیسا کہ ان کا معمول رہا ہے، عجز بیان کی دلیل ہے''۔(''تنقیدی تبصرے''،ص:۲۱۵)

پروفیسر محمود الهی:

کلیم الدین احمد کے استدلال، ان کے مطالبات اور ان کے تجزیے کی بنیاد علم ودانش، شعر وادب کے عمیق مطالعے پر ہوتی ہے۔ انہیں عام طور پر مغرب زدہ بتایا جاتا ہے؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مشرقی بالخصوص اردو ادب کے منتہی نہیں ہیں۔ اردو ادب کی رگ رگ سے وہ اتنا ہی واقف ہیں، جس کی توقع کسی بڑے عالم، یا نقاد سے کی جاسکتی ہے''۔ (''کلیم الدین احمد: شخصیت اور تنقید نگاری''، ص:۱۱)

پروفیسر شارب ردولوی:

''کلیم الدین احمد کی اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تصنیفات نے ایک بار اردو تنقید اور نقادوں کو جھنجھوڑ دیا۔ جس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نقادوں کو زیادہ غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان کی سہل پسندی پر کلیم الدین احمد کی تصنیفات ایک ضرب کاری کی حیثیت رکھتی ہیں''۔ (''جدید اردو تنقید: اصول ونظریات''، ص:۴۱۸)

پروفیسر وهاب اشرفی:

''کلیم الدین احمد حالی کے بعد اردو کے سب سے اہم نقاد بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے اپنی جارحانہ تنقید سے اردو کی کئی صنفوں کی دھجیاں اڑائیں، اس حد تک کہ ایک طویل بحث کا سلسلہ کلیم الدین احمد کی زندگی میں ہی شروع ہوا، جو آج تک جاری وساری ہے؛ لیکن ایسے تمام مباحث کے باوجود اردو تنقید میں ان کی حیثیت محفوظ ومامون ہے''۔ (''کلیم الدین احمد مونوگراف''، ص:۱۶)

ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ:

''ان کی تنقید میں ان کی شخصیت کی روشنی بڑی تیز اور گہری ہے۔ ان کی تنقید کی سطر سطر سے ان کی شخصیت، ماحول اور نسلی خصوصیت کی پرچھائیاں جھانکتی ہیں۔ ''اردو میں تنقید کا وجود اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر'' یہ جملہ یوں ہی زیب داستاں کے لیے نہیں ہے۔ اس پر شخصیت کی گہری چھاپ ہے، جس طرح شاعری میں سوچنے کا ڈھنگ جدا جدا ہوتا ہے، تنقید اس ضابطے سے خارج نہیں ہے''۔
(''نذر کلیم''۔ ص:۷۰)

ڈاکٹر ظفر اوگانوی:

''کلیم الدین احمد اردو میں ایسے پہلے نقاد ہیں، جنہوں نے تنقیدی شعور اور ادب اور پھر ادبی تنقید کی کڑیوں میں ایک متوازن ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی کوشش میں وہ پرخلوص تھے کیوں کہ ان کا تنقیدی ڈیڈیکیشن اردو ادب کو بے سمتی سے نجات دلانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔کلیم الدین احمد نے جس دقت نظر اور اپنے وسیع تر مطالعے اور فکری انفرادیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ادبی تنقید کے اصولوں کی بازیافت کا جو کارنامہ انجام دیا ہے، اردو میں حالؔی کے بعد اس کاوش کو یقیناً ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے''۔ (''کلیم الدین احمد سیمینار کے مقالے''، ص:۶۴)

پروفیسر نجم الهدیٰ:

''عملی تنقید'' کلیم الدین احمد کا وہ کارنامہ ہے جو میرے نزدیک ان کی نظریاتی تنقید پر بھاری ہے اور خود اردو تنقید میں اس ہیئتی تجربے کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے منتخب غزلوں کے اشعار پر عملی تنقید کے جو نمونے پیش کئے ہیں، اردو میں ان کی ضرورت تھی۔ یہ ہیئتی تنقید کی عمدہ ترین مثالیں ہیں۔۔۔۔۔۔''عملی تنقید'' نام کی کتاب میں کہیں تاثرات کی پرچھائیں بھی نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ وہ حضرات بھی جو کلیم صاحب کے لب ولہجہ کی شدت اور ان کے ناقدانہ مزاج کا تیکھاپن کچھ زیادہ ہی محسوس کرتے ہیں اور ان کی ایسی تحریروں کو سامنے رکھ کر جن میں ادعائیت جذباتیت کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ انہیں تاثراتی تنقید نگاروں کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ عملی تنقید کو مستثنیٰ قرار دینے پر مجبور ہیں''۔ (''کلیم الدین احمد سیمینار کے مقالے''، ص:۹۲)

پروفیسر عبد الواسع:

''کلیم الدین احمد کی شاعری اور تنقید نے اردو شعر وادب کی دنیا میں ایک شور بپا کیا۔ شاعری نے کم اور تنقید نے زیادہ۔ ''اردو شاعری پر ایک نظر'' اور ''اردو تنقید پر ایک نظر'' غیر معمولی اہمیت کی حامل کتابیں ہیں۔ ان کتابوں نے ہماری شاعری اور ہماری تنقید کی راہیں متعین کیں۔ ان سے اردو تنقید کو نئی روشنیاں ملیں۔ وہ براہ راست اور دوٹوک انداز میں بات کرنے لگی۔ ہاں اور نہیں کی تاریکیوں سے باہر آئی، وہ جہاں ہیں ہوئی''۔ (''کلیم الدین احمد سیمینار کے مقالے''، ص:۸۴)

پروفیسر ابو الکلام قاسمی :

''ادبی تنقید کی نئی روشنی اور عالمی اصولوں سے کم وبیش یکساں طور پر باخبر ہونے کے باوجود کلیم الدین احمد اپنے معاصرین کے درمیان ادبی جمالیات اور تنقیدی ضابطہ بندی کے معاملے میں اسی طرح ممتاز دکھائی دیتے ہیں، جس طرح حالیؔ اپنے معاصرین اور متاخرین کے درمیان ۔۔۔۔۔۔۔ بہ حیثیت تنقید نگار تجربے کی نوعیت اور الفاظ کے انتخاب کی منطق کے مابین نہایت باریک تفریق قائم کر کے اپنی تنقیدی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ ان کی سائنٹفک زبان ان کی تنقید کی ایک بڑی قوت ہے''۔ (''معاصر تنقیدی روے''، ص:۱۰۲۔۱۱۹)

پروفیسر اعجاز علی ارشد:

''ان کی تنقید میں جو وضاحتی انداز بیان اور ہر بات کو اس کی پوری تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کا انداز بیان ملتا ہے تو وہ لیوس کے اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہر موضوع کا گہرائی سے اور تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں اور اس موضوع پر اظہار خیال کرتے وقت اپنے ہر دعوے کے لیے دلائل فراہم کرتے جاتے ہیں ۔۔۔۔۔ انہوں نے ادھر ادھر سے چند شخصیتوں کا انتخاب کر کے ان کے فن پاروں کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی ہے؛ بلکہ مختلف اصناف ادب کو موضوع بحث بنایا ہے اور ان اصناف کا جائزہ لیتے وقت ان کی پوری تاریخ کو سامنے رکھا ہے''۔ (''بہار میں اردو تنقید''، ص:۵۵)

ڈاکٹر ابرار رحمانی:

''کلیم الدین احمد ایک اہم اور معروف نقاد ہیں۔ وہ پہلے نقاد ہیں، جنہوں نے اپنی تنقید میں بے لچک رویہ اپنایا۔ وہ کبھی تنقید میں رنگین بیانی اور انشا پردازی کے قائل نہیں رہے، چنانچہ انہوں نے آزاد پر تنقید کرتے ہوئے ان کی تنقید کا سب سے بڑا عیب ان کی انشا پردازی بتایا۔ کلیم الدین احمد محض نظری تنقید کے قائل نہیں۔ وہ عملی تنقید میں یقین رکھتے ہیں۔ جب وہ کسی فن پارہ پر تنقید کرتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ صرف اس فن پارہ کے سیاق وسباق سے بحث کی جائے''۔ (''کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ''، ص:۹)

ڈاکٹر زائرہ کلیم:

"The World Calls him a professor and educationist, a poet and a prose writer, a literary critic call of the first water, linguist and a lexicographer, but I him a King among men and the greatest man among men"

(''نذر کلیم''۔ ص:۴۰)